سندھ کے صوفی شاعر
محمد ابراہیم جویو

سندھ کے صوفی شاعر

محمد ابراہیم جویو

فکشن ہاؤس
۱۸-مزنگ روڈ، لاہور

نام کتاب = سندھ کے صوفی شاعر
مصنف = محمد ابراہیم جویو
پبلشرز = فکشن ہاؤس
18_ مزنگ روڈ، لاہور
فون: 7249218, 7237430
پروڈکشن = ظہور احمد خان / رانا عبدالرحمان
معاون = ایم سرور
پرنٹرز = زاہد بشیر پرنٹرز لاہور
سرورق = ریاظ
اشاعت = 1997ء
قیمت = -/60 روپے

مترجم

شاہ، سچل اور سامی سندھ کے عظیم صوفی شعراء نہ صرف پاکستان میں بلکہ بین الاقوامی سطح پر پہچانے جاتے ہیں۔ ان کا پیغام ہر اہل دل انسان کی روح اور فکر کے لئے باعث تقویت و تسکین ہے جو ہر منزل پر انسان کی رہنمائی کرتا ہے۔ وادی سندھ کو یہ فخر حاصل ہے کہ ان صوفی شاعروں کا تعلق سندھ کی سرزمین سے ہے۔ یہ تینوں شاعر تقریباً ہم عصر بھی ہیں۔

محمد ابراہیم جویو صاحب نے اپنی کتاب "شاہ، سچل، سامی" میں ان تینوں شاعروں کے دور کی سیاسی، مذہبی، تہذیبی اور اقتصادی صورت حال کا جائزہ پیش کیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ میں نے ترجمہ کرنے کے لئے اس کتاب کا انتخاب کیا ہے۔ یہ شاہ، سچل اور سامی کے کلام کے پس منظر کی عکاسی کرتی نظر آتی ہے جو ان کے کلام میں جھلک رہا ہے۔

یہ کتاب کثیر حوالوں کی موجودگی میں جہاں اس اہم تاریخی دور پر روشنی ڈالتی ہے وہیں بعض مقامات پر تشنگی کا احساس بھی ہوتا ہے جس کا سبب یہ ہے کہ محمد ابراہیم جویو صاحب نے ایک وسیع موضوع کو اختصار کے ساتھ پیش کرکے دریا کو کوزے میں بند

کرنے کے مترادف ایک کوشش کی ہے جو اس موضوع کے ساتھ ناانصافی ہے۔ میرا خیال ہے کہ اس موضوع پر ایک ضخیم کتاب ہونی چاہئے۔

اس کتاب کو پڑھنے سے اس عہد کا جو خاکہ ذہن میں آتا ہے وہ ان عظیم شعراء کے پیغام کو سمجھنے میں مددگار ثابت ہوتا ہے۔ اور چونکہ یہ کتاب سندھی زبان میں لکھی گئی لہٰذا سندھی زبان سے ناآشنا افراد اس سے فائدہ حاصل نہ کرسکتے ہیں۔ اس کا اردو ترجمہ کرنے کا ایک مقصد یہ بھی ہے کہ اس سے زیادہ سے زیادہ لوگ فائدہ حاصل کر سکیں۔

اہل زبان نہ ہونے کے باعث بعض مقامات پر مجھے کافی دشواریوں کا سامنا کرنا پڑا جس کے باعث میں نے لغت سے استفادہ حاصل کرنے کی کوشش کی۔ اس کے علاوہ جناب محمد سلیم خواجہ صاحب، جنہوں نے اپنی تمام مصروفیات کے باوجود ہر قدم پر مجھ سے تعاون کیا اور میری رہنمائی کی اپنی ذاتی کتب، بیش قیمت وقت دے کر، انہی کی مدد اور رہنمائی کے باعث یہ ترجمہ پایہ تکمیل کو پہنچا، اس تعاون کے لئے میں ان کی ازحد مشکور ہوں۔

مترجمہ

سیدہ شگفتہ اشتیاق

۱۰۔ اکتوبر ۱۹۸۵ء

دیباچہ

میں نے اس مضمون میں شاہ' سچل اور سامی کے دور کا ایک مطالعہ پیش کیا ہے۔ اس میں میں نے اس دور کے ساتھ اجمالی طور پر خود اس دور کے پس منظر میں سندھی سماج کے تمام تاریخی دور کی سیاسی' مذہبی' تہذیبی صورت حال کا جائزہ لیا ہے۔ سندھ کی تاریخ کا یہ ایک وسیع سماجی پس منظر ہے' جس کی روشنی میں شاہ' سچل اور سامی کی شاعری کا جامع مقصد اور اس کی اہمیت کو سمجھا جا سکتا ہے۔

سندھی سماج کی تاریخ میں شاہ' سچل اور سامی ایسے ہیں جیسے زمین کے اندر اس کی تہہ در تہہ انمول ہیرے چھپے ہوتے ہیں۔ اس مضمون میں میں نے ان کی سدا روشن رہنے والی فکر اور پیغام کا اور سندھی سماج کے لئے اس کے معنی اور اہمیت کا جائزہ پیش کیا ہے۔

یہ کہنے کی واقعی کوئی ضرورت نہیں کہ شاہ' سچل اور سامی کے دور اور ان کی شاعری کا یہ مطالعہ میرا اپنا مخصی مطالعہ ہے' لیکن اس کی حمایت میں اتنا ضرور کہہ سکتا ہوں کہ اگر کوئی دوسرا بھی ان بزرگ شاعروں کے پیغام کا اسی سماجی پس منظر کی روشنی میں ، جائزہ لے گا تو وہ بھی اس میں وہ ہی معنی اور بنیادی فہم دیکھے گا جو میں نے مخصی

طور پر اس میں دیکھے ہیں۔

بولی اگر کسی قوم یا سماج کے تمام تجربے کی یادداشت ہے تو شاعری اس کے اہم ترین تجربے کی یادداشت ہے۔ اور اگر بات اس کی بہترین شاعری کی ہو تو اس کی افادیت بھی اس کے لئے ایسی ہی انوکھی' سچی اور اعلیٰ ہو سکتی ہے۔ اس مطالعے میں شاہ' سچل اور سامی کی شاعری میں اسی اہمیت اور افادیت کی بات کی گئی ہے۔

میں نے سوچا کہ اس مضمون کے ساتھ اس کے مرکزی خیال کی حمایت میں سندھ کے ان لاثانی شاعروں کا انتخاب بھی دے دوں لیکن کچھ دوستوں کے مشورے پر مضمون کو جیسا تھا ویسا ہی شائع کرایا۔ اور یہ پڑھنے والوں کی سمجھ بوجھ پر چھوڑ دیا کہ اس کی روشنی میں سندھی بولی کے ان محبوب اور محب وطن شاعروں کی تمام شاعری جو ان کے اپنے ماضی کی تہذیبی تاریخ کا ورثہ ہے اسے خود پڑھیں' سمجھیں اور دل میں بسائیں۔

انسانی معاملات میں حسن' نیکی اور خیر' ان کی پہچان' حاصلات اور تعبیر' یہ باتیں جذبے اور عشق کے سوا ممکن نہیں ہیں۔ اور جذبے اور عشق کی باتیں یکطرفہ ایمان اور بے روح تشدد اور اقتدار کے ماحول میں کبھی تو ہمت کا دامن تھا' کر کہی ہی جاتی ہیں۔ جیسے سچل سائیں نے کہنا چاہیں اور کہیں بھی۔

سچ مرد چون' بکی وکی وکی..... مرد ہیں جو سچ کہتے ہیں' کسی کو اچھا لگے یا برا..... لیکن اکثر حالتوں میں' جیسے خود سچل سرمست نے بھی مناسب سمجھا' ان کو سیدھی طرح کہنے کے بجائے کسی رمز اور ڈھنگ سے کہنا ضروری ہوتا ہے۔

مات کیان تہ مشرک تیان' کچان تہ کافر' اٹھی ء واء وڑ کو سمجھی "پیہڑ نو" چو پی۔

چپ رہوں تو مشرک ہو جاؤں' کہوں تو کافر' پیہڑ نہ کہتا ہے اس بات کی معنی کون ہے جو سمجھے۔

ہم جو کچھ سنتے ہیں پڑھتے ہیں اور جو کچھ سوچتے یا سمجھتے ہیں وہ اپنے ماحول کے مطابق اور اپنے مسائل کی روشنی میں- کسی کے سامنے کیسے مسائل ہوتے ہیں' اہم بات یہ ہے- اپنے ان مسئلوں کی روشنی میں ہی ہر ایک انسان اور ہر ایک سماج' اپنی راہ کا پتہ تلاش کرتا ہے' اپنی تاریخ اپنے ادب اور اپنے تمام تہذیبی ورثے کی حاصلات میں- شاہ' سچل اور سامی کے کلام میں سندھی سماج کے لیے اس راہ کا اس وقت کون سا پتہ' نشان موجود ہے' یہ معلوم کرنا ہم میں سے ہر ایک کا آج فرض ہے- میں نے اس مضمون میں ان کے کلام کے اسی نشان کو تلاش کرنے کی اپنی سی ایک کوشش کی ہے-

مضمون کے آخر میں "ہم اور شاہ" کے عنوان سے اپنی ایک مختصر بات جو کہ حال ہی میں ہماری نئی پیڑھی کی ایک نمائندہ مخزن میں شائع ہوئی تھی وہ جیسی' تیسی شامل کی گئی ہے' اس لئے کہ وہ مضمون کے مرکزی خیال سے پوری طرح مطابقت رکھتی ہے بلکہ اسے ایک طرح سے اس مضمون کا اختصار بھی کہا جا سکتا ہے-

آخر میں ایک اعتراف کرنا بھی ضروری ہے- یہ مضمون جس طرح پڑھنے والوں کے سامنے ہے اس طرح ہرگز ممکن نہ بنتا اگر کچھ عرصہ پیشتر سندھی ادبی بورڈ کی طرف سے تاریخ کے اصل ماخذات شائع نہ ہوئے ہوتے اور خاص طور پر ہمارے محترم بزرگ اور میرے عزیز دوست پیر حسام الدین شاہ راشدی کی سندھ کی تاریخ پر کی گئی تحقیق زیر اشاعت نہ آئی ہوتی- ہم پر اس اپنے علمی ادارے اور سندھ کے اس محب وطن بزرگ عالم اور دانشور کی تہ دل سے شکرگذاری لازم ہے-

محمد ابراہیم جویو

حیدر آباد سندھ

۱۷ جنوری' ۱۹۷۸ء

شاهم

وارُو ويراڳين ڪَسي وِيلَ وَرَ وساريج،
قدرَ ڪاپڙين جا ليلائي لنهوءِ ج،
پيرَت پَسيو پَٽَ جي، وڃڻ ڪي وجيج،
راتو ڏينهن رڙهيج، آءٌ نہ جيئندي آن ري.

جُز وڃايو جوڳين، ڪُل سين آهين ڪَرِ،
آسڻ جن عدمُ، آءٌ نہ جيئندي آن ري.

—

جي پاڻين وَس چَران، تہ سنگهارن سي لَڏَ،
تہ هاڃوي سندي هَڏَ، ڪُوڪَ نہ سڻين ڪَڍهين.

جي پاڻين وَس چَران، تہ سنگهارن سي گهار،
جنين سندي واڙِ، چورَ نہ ايندا ڪَڍهين.

— —

سچل

صورت ۾ جاءِ دم جي، دم ريءَ نه صورت ڪم جي،
دم ۾ جا لذت غم جي، وهه واهه ڳالهه خاصي.

ابليس جي وڏائي، هر سانس تي سوائي،
جيون ته دم ڀلائي، نه ته ڪهت نحس نامي.

ثابت ”سچل“ سچاري، يارن جي ياد ياري،
وحدت جني وساري، تن تَنَ مٿي اٿامي.

—

ڇڪو گوندرُ غمُ، جي مون ڀڃو جيئيون،
منجهه ڪشاليُ ڪمُ، آهي ورهه وارئين.

متان وهين مات ۾، منجهه جلديءَ جُل،
هتي ويهه نه، هلُ، ٿان ڪي ڀڄين پنڌ ڪي.

— —

سامي

آڻ هوندي پولي، وڏو جيءَ پرم ۾،
جئن ڪستوري ناپ ۾، مرگهه باهر ڦولي.

—

عشق ۽ عقلُ، ٻنهي ساڌنَ سترَ جا،
ساڌي لنهه ”سامي“ چئي، آتمَ پدَ عملُ.

—

عجائب عقلُ، ساڪ ڏنو سڪ سان،
سمجهي روح راضي ٿيو، ڇڏي هنگامو هلُ،
وحدت ۾ واصلُ، ٻرجي ٿيو ٻريم ۾.

—

ويدَ، پُرانَ، قرآنُ ڪو، سيني ۾ هڪ سُوتُ،
سمجهي ڏس ”سامي“ چئي، لائي منَ مضبوطُ.

—

خالقَ منجهه خلقَ، خالقُ سڀ خلق ۾،
سمجهي ڪو ”سامي“ چئي، ورلو جنَ هڪ.

—

نڪو آرُ نه پارُ، سُپيربان جي سڪ جو،
سُنانتيءَ ٻنان سيپ ڪي، اڇي ڪينَ قرارُ.

—

مُک سان وارَ چنيا، سانت نہ اچي جيءَ کي،
آنَ پاڻيءَ جي ناتوَ سان ٻڪَ اَچ کين لهي،
نگر ڀهچي ڪونہ ڪو، ٻنان پنڌَ ڪيئي،
ڳُرگر رهت رهي، تہ مُکي ٿئي "سامي" چئي.

—

وڏو وچ وڇاءُ ڪوٺيءَ رهڻيءَ ڀاڻ ۾،
ورلي ڪنهن گرمُک کي "سامي" پيو سماءُ.

—

آهن آگم آپار، راهان وار ملڻ جون،
تن سيني ۾ هڪڙي، ساڌ سنگت نج سارَ.

—

ڪيڏي وڏائي، گُڻيان سا ٻُرسن جي،
سر دري، سيتل سدا، سڀ جا سُکدائي،
ممتا ميل اندر ۾، رکن نہ رائي،
"سامي" سدائي، ڪن آهڪار آچاھَ ٿي.

—

منجھين ڌَنَ تنوارَ وڄي ويل سيکنهين،
چنگ تنبورا ڪيترا، آهن ساز اپار،
انئي ٻهر اندر ۾ "سامي" ڀرينءَ پچار،
ڪنهن ڪنهن مگنهار، سُوجهيي هين سرود جي.

قومیں' ملک اور معاشرے کے ذریعے سے پہچانی جاتی ہیں۔ سندھ اور سندھی معاشرے کی شناخت بھی تین شاعروں شاہ' سچل اور سامی سے ہے۔ سندھی زبان کے یہ تابندہ اور لافانی شاعر سندھی معاشرے کی کامل نیکی' بھرپور حسن اور مکمل سچ کے عارف' امین اور ترجمان ہیں۔

سندھی معاشرے کی حدیں محض موجودہ سندھ کی جغرافیائی اور سیاسی حدوں پر ختم نہیں ہو جاتیں بلکہ یہ پاکستان اور پاکستان سے باہر تک پھیلی ہوئی ہیں۔ جہاں بھی کوئی سندھی خاندان مقیم ہے وہاں سندھی معاشرہ موجود ہے' اور اس کی پہچان سندھی زبان اور اس کے قابل احترام شاعروں شاہ' سچل اور سامی کے تعلق اور محبت میں مضمر ہے۔ (سندھ میں یا سندھ سے باہر آباد کوئی بھی خاندان اگر اپنے گھر میں سندھی زبان نہیں بولتا اور سندھی سماج کی تاریخی ان لاثانی ہستیوں اور سندھی تہذیب کے ان عظیم معماروں کو نہیں جانتا تو وہ خود کو سندھی سمجھنے اور کہلانے کا حقدار نہیں ہے۔)

کسی بھی قوم' ملک یا معاشرے میں عظیم انسان روز روز پیدا نہیں ہوتے اور جب پیدا ہوتے ہیں تو اپنے عہد کے نئے جنم کا سبب بن کر پیدا ہوتے ہیں۔ ان کا اپنے عہد کے ساتھ ایک وعدہ ہوتا ہے اور وہ تاریخ کی ایسی گھڑی کے لئے اپنی ذات میں نئی اور

پرانی قدروں کے ترجمان بن جاتے ہیں۔ وہ نمایاں صلاحیتوں کے مالک ہوتے ہیں۔ وہ بے حد اہم اور طاقتور ہونے کے ساتھ اپنے لوگوں کے لئے نئی راہیں بنانے والے ہوتے ہیں جن پر آئندہ ادوار میں بلکہ ہمیشہ کے لئے انھیں چلنا ہوتا ہے۔ اور آگے بڑھنے کے لئے دوسرے راستوں کا کوئی رخ ان کے لئے قابل شناخت یا قابل سفر رہتا ہی نہیں۔ وہ اپنے ساتھ کوئی خواب، کوئی آدرش فکر، کوئی فطری حکمت کا خزینہ لے کر آتے ہیں جنہیں وہ نہ صرف اپنے لوگوں کو آشکار کرتے بلکہ ثابت بھی کر دکھاتے ہیں کہ وہ کس طرح سے اپنے آپ کو تیار کریں، تاکہ وہ اپنی اجتماعی زندگی میں راستے کی اونچ نیچ، دھوکے اور فریب کاریوں سے محفوظ رہ سکیں۔ مہذب قوموں نے ہمیشہ اپنی ایسی عظیم شخصیتوں کو پہچانا ہے۔ ان سے اپنا تعلق مضبوط کیا ہے اور انھیں اپنے لئے ایک انمول نعمت جانا ہے۔ قوموں، ملکوں اور معاشروں کی یہی محسن اور عظیم شخصیات اپنے اپنے دور کی باغی بھی ہوتی ہیں۔ وہ اپنے عہد کی مروجہ اور مسلمہ تربیتی سرشتوں کی پیداوار نہیں ہوتیں بلکہ اپنی ذات میں ایک نیا اور انوکھا کردار سموئے ہوتی ہیں۔ مروجہ سرشتے اور نظامہای حیات تو اکثر غرور میں ڈوبے ہوئے خامیوں سے پر، تنگ نظر لوگ ہی پیدا کرتے ہیں، جن کے دلوں کے دروازے بند پڑے ہوتے ہیں۔ اور وہ دوسروں کو کمتر سمجھتے ہیں، اپنی ہر بات کو دوسروں کی بات پر فوقیت دیتے ہیں۔ اور سارا وقت لڑنے جھگڑنے میں گذار دیتے ہیں۔ یوں وہ ٹھہرے پانی کی طرح ہیں جس کی بدبو میں اضافہ ہوتا رہتا ہے۔ ان کے برعکس عظیم شخصیتیں اپنے سماج میں نئے انسان ہو کر ابھرتی ہیں، اور اس میں انسان نئے پیدا کرنے کی داعی ہوتی ہیں، ایسے انسان جو روح کی تازگی سے سرشار ہوں۔ یہ لوگ ذاتی مفاد سے بلند ہو کر بنی نوع کے مفاد کو عزیز رکھتے ہیں۔ اور اپنے لیے نہیں بلکہ اپنی قوم، سماج اور معاشرے کے لئے زندہ رہتے ہیں۔

وہ اپنی پوری زندگی اور سارا وقت دوسروں کے لئے سکون کی تلاش اور نئی دنیا کی تعمیر میں گذار دیتے ہیں۔ اور اپنی ذات سے یہی بے نیازی، دوسروں کے لئے فکر

مندی، صرف ایک مقصد کے حصول کے لئے ساری کوششیں، اور غیر معمولی حوصلہ، ان کی عظمت کی نشانیاں ہیں۔ ان کے لئے یہ کہنا درست ہے کہ وہ اپنے حصے کا کام خوب کر گئے ہیں اور اسی لئے ہمیشہ زندہ رہتے ہیں۔

تاریخ کی یہ لازوال ہستیاں اپنے جوہر میں بے مثل ہوتی ہیں کیونکہ جو کچھ یہ اپنے معاشرے، ملک اور قوم کو اور اس کے ذریعے سارے عالم انسانی کو دے جاتی ہیں اس قدر کوئی دوسرا کبھی نہیں دے سکتا۔ یہ ہستیاں اپنی قوم کو جو نایاب اور بے بہا خزانہ دے کر جاتی ہیں اس کی قدر و قیمت دنیاوی اور مادی دولت سے زیادہ روحانی اور تخلیقی دولت سے متعین ہوتی ہے۔ دنیاوی اور مادی اشیاء خواہ کتنی ہی اعلیٰ اور ارفع کیوں نہ ہوں ان نعمتوں سے بہتر نہیں ہو سکتیں جو نعمتیں یہ ہستیاں ہمیں دے جاتی ہیں۔ کوئی مہم، دریافت یا ایجاد آج نہیں تو کل ایک آدمی کے ہاتھ سے نہیں تو دوسرے کے ذریعے ہمیشہ ممکن ہے۔ لیکن انسان کے اندر، دل و دماغ اور روح میں جو کچھ بھی ہے یا ابھر رہا ہے اور پرورش پا رہا ہے اس کا اس انداز میں اظہار کرنا کہ اسے دیکھ کر یا سن کر یہ محسوس ہو جیسے کسی نے اسی انوکھے اور نامعلوم اسرار باطن کی ایک جھلک پا لی ہو، یہ ایک بنیادی اور بے بدل سعادت ہے جس کے صرف فلسفی، شاعر یا فنکار ہی اہل کہے جاتے ہیں۔ اور وہی اپنے عہد اور اپنی دنیا کے حقیقی اور سچی امنگ کو اپنے اپنے انداز میں کوئی خاص روپ دے کر آئندہ نسلوں کے لئے ورثے کی شکل میں چھوڑ جاتے ہیں۔

ارسطو کا قول ہے کہ "شاعری فلسفے سے زیادہ فکر انگیز اور تاریخ سے زیادہ سبق آموز ہوتی ہے" اس کی وجہ یہ ہے کہ شاعری مجموعی طور پر انسانی فطرت میں زیادہ عمیق جھانکتی ہے۔ اس کی خصوصیت بلکہ اس کی عظمت کی دلیل ہی یہ ہے کہ وہ اندر کے تجسس کی بات کے اصل کی لفظوں کی نہیں بلکہ روح کی عکاسی کرتی ہے۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ شاعری اپنے عہد پر اور اس کے لوگوں پر تیز تر روشنی ڈالتی ہے اور اس

طرح ان سے زیادہ یکدل اور قریب تر ہو کر انہیں زیادہ صاف اور درست طور پر سمجھتی اور بیان کرتی ہے۔ اس سلسلے میں عظیم شاعری کے لئے یہ بھی ضروری نہیں کہ وہ اپنے دور کے واقعات تفصیل سے بیان کرے یا ان کی طرف واضح اشارے کرے۔ کبھی کبھی تو ایسا نہ کرنا مروجہ حالات کے تحت اس کے لئے لازمی ہو جاتا ہے' بلکہ یہ اکثر اس کی فنکارانہ صلاحیتوں کی دلیل سمجھی جاتی ہے۔ وقت کی حقیقتوں کا مکمل اور سچا عکس بہرحال اس میں ضرور موجود ہوتا ہے' اور اسی خیال سے اس میں تاریخ کی جھلک ہوتی ہے۔ اس کے ساتھ ہی اس میں ان حقیقتوں کی تعبیر بھی موجود ہوتی ہے۔ اور اس لحاظ سے اس میں فلسفہ اور حکمت کی جھلک بھی ہوتی ہے۔ ان سب کے علاوہ اس کی اظہاری صورت حال میں تمام فنون لطیفہ کا واضح اظہار اور اشارتی حسن بھی موجود ہوتا ہے' جسے محسوس کرنے کے علاوہ دیکھا اور سنا بھی جا سکتا ہے۔ اور مختلف حالات میں چکھا' سونگھا اور چھوا بھی جا سکتا ہے۔ بلکہ یہ کہنا درست ہو گا کہ شاعری کلیہ قابل داد حسن ہی اس کی روح ہے۔ اسی لئے عظیم شاعری ایک لافانی چیز بن جاتی ہے۔ جبکہ عظیم شاعری اور اس کے علاوہ ہر تحریر میں موجود سچائی اور حکمت کے کئی نکات اور نشان وقت کی تبدیلی کے ساتھ ہلکے اور غیر ضروری بھی بن سکتے ہیں۔ لیکن اس کا حسن اور خوبصورتی دائمی ہے جو ہر دور اور ہر زمانے میں دل پر اثر کرتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ شاعری اپنی حقیقت نگاری' حکمت اور حسن کے باعث نہ صرف گذشتہ ادوار کے مقاصد اور امنگوں کی آئینہ دار اور ترجمان ہوتی ہے بلکہ ان کی توسیع اور تبلیغ کے لئے بھی سب سے زیادہ بااثر اور دائمی وسیلہ شمار ہوتی ہے۔

سندھی سماج کی تاریخ میں مذہب اس پر ہمیشہ غالب رہا ہے۔ سندھی معاشرے کا ہر مذہب سے اس کی فاتحانہ حیثیت سے واسطہ پڑا ہے۔ آریاؤں' ایرانیوں' یونانیوں' عربوں' یہاں تک درمیان میں بدھ مت "اھسنک" موریہ اور کشان خاندانوں' ویدانتی گپتا اور برہمن خاندانوں' ان سب نے سندھی سماج کو اپنے اپنے مذہب سے فاتحانہ یا

م از کم حکومتی انداز میں روشناس کرایا ہے۔ سندھ کی تاریخ میں صرف ایک سو سال کا عرصہ (۱۸۴۳ سے ۱۹۴۸ء) ہے جس مسیحی فاتح قوم نے اپنی سیاسی اور تہذیبی فوقیت قائم رکھنے کے لئے مذہب کو ہتھیار کے طور پر استعمال نہیں کیا۔ بلکہ جس صورتحال کو جدید دنیا میں "مذہبی آزادی" کہا جاتا ہے اسے اپنی حکومتی پالیسی میں قائم رکھا۔ یہ کتنے افسوس کی بات ہے کہ مذہبی آزادی کے اس مختصر دور میں ہی اقتدار اور شان و شوکت سے محروم لیکن اسے دوبارہ حاصل کرنے کا شوق رکھنے والا مذہب سیاست کو آلہ کار بنا کر' سندھی سماج کی اکائی بلکہ اس کے وجود کو زیادہ سے زیادہ نقصان پہنچا سکا۔ سندھی سماج میں مذہب کے اس صدیوں سے قائم شدہ غلبے اور اس غلبے کی لازمی شدت اور انتہا پسندی نے سندھ کی ذہنی دنیا میں' علمی سطح پر اور بحیثیت مجموعی' دوسری باتوں کے علاوہ ایک خاص قسم کے دوہرے ردعمل کو جنم دیا جسے "مذہبیت" سے مایوسی اور بیزاری لیکن "مذہب" سے عقیدت اور وابستگی کی روش کہا جا سکتا ہے۔ یہاں تک کہ سندھی سماج کی یہی دوہری کیفیت جس نے اس میں مذاہب اور مذہبی فرقوں کے سلسلے میں ہم آہنگی اور کشادہ دلی کی عام روش کو جنم دیا تھا' سندھی تہذیب کے ارتقاء کا ایک بنیادی پتھر بن گئی۔

مذہب' ریاست اور تہذیب انسانی معاشرے کی تنظیم کے تین لازمی اور بنیادی شعبے ہیں' لازمی اور بنیادی اس لئے کہ وہ انسانی نفسیات کا ازلی اور فطری تقاضوں کا جواب ہیں۔ انسان کو قطعی حیوانیت کی سطح سے انسانیت کی بلند سطح تک اپنے وجود کی سلامتی کی فکر رہتی ہے۔ وہ ان دیکھے کے خوف کا' دوسرے (اپنے جیسے حیوان) انسان سے خوف کا اور خود اپنے اندر کے حیوان (بھوک' جنس اور درد وغیرہ) کے خوف کا شکار رہتا ہے۔ ان تینوں طرح کے خطرات سے بچنے کے لئے وہ ایک بہت بڑی پناہ گاہ کی تلاش کرتا ہے جسے وہ معاشرے کا نام دیتا ہے۔ اپنی اس وسیع پناہ گاہ میں وہ ان تین خاص خطرات سے بچنے کے لئے تین خول یا غلاف تیار کرتا ہے۔ ان دیکھے خوف سے

بچنے کے لئے مذہب کا خول' دوسرے انسانوں سے بچنے کے لئے ریاست (راج' حکومت' سرکار) کا خول اور اپنے نفس یا حیوانی فطرت سے بچنے یا اس کی تشفی کے لئے تہذیب (ثقافت وغیرہ) کا خول۔ مذہب کے خول میں بیٹھ کر اسے ان دیکھی' اپنے سے قدرے دور اور اعلیٰ (واحد' دوہری' ثلیثی یا کثیر نوع کی) طاقت کو ماننا یا منوانا اور اس کی دوستانہ باتوں کو اپنے بس میں کرنا یا ان سے بچنا پڑتا ہے' یہی سب کچھ ایمان یا ایقان کا مسئلہ اور سلسلہ ہے۔ ریاست کے خول میں بیٹھ کر اسے ایک کی طاقت اور مفاد کو دوسروں کی طاقت اور مفاد سے ملا کر اپنے بچاؤ اور مفاد کے انتظام کو بڑھانا پڑتا ہے' یہ سب کچھ ان کے اجتماعی طاقت اور اقتدار کی تنظیم اور اس کے استعمال کا مسئلہ ہے۔ تہذیب کے خول میں بیٹھ کر اسے اپنی حیوانی کشش اور ذہنی ہیجان کی تقلید میں اپنی سکھ اور سمجھ کے مطابق خارجی فطری وسائل کو اپنے بس میں کرنا پڑتا ہے' اور اپنی اس حیوانی کشش اور ہیجان کو بھی قابو میں رکھنے کی کوشش کرنا پڑتی ہے' اور وہ سب کچھ اس کی اپنی عقل (ذہنی یا روحانی صلاحیت) کی نشوونما اور اس کے استعمال کا مسئلہ ہے۔ اس طرح ایمان یا عقیدہ مذہب کی بنیادیں بڑھانے اور مضبوط کرنے کا اور عقل یا ذہن تہذیب کی بنیاد اور اس کے پھیلاؤ اور مضبوط بنانے کے مرکزی نکتے ہیں۔

ایمان اور طاقت خودی اور گھمنڈ سے بھرے ہوئے' خود کفیل ہونے کے فریب میں مبتلا رہتے ہیں' اور دائیت کو اپنا حق سمجھتے ہوئے تھوڑے سے گھماؤ پھراؤ یا تبدیلی کے لئے بھی تیار نہیں ہوتے' اور اسی لئے وہ خاص طور پر عقل کے دشمن اور رقیب ہوتے ہیں۔ کیونکہ عقل ہمیشہ دونوں کی خود پسندی' خود سری اور خود کفالت کی خام خیالی پر نہ صرف تنقید کرتی ہے بلکہ اس کی مخالفت پر آمادہ بھی رہتی ہے۔ مذہب اور ریاست کے شعبوں سے متعلق لوگ اس طرح ہمیشہ اپنی دنیا کو تبدیل کرنے سے بچتے ہیں' اور اسے جوں کا توں رکھنے کی کوشش کرتے ہیں' اور لوگوں کے عقل کے استعمال اور ان کی فکری آزادی کو دبائے اور روکے رکھتے ہیں۔ ایمان یعنی مذہب اپنی مضبوطی

کے لئے طاقت یعنی ریاست پر قبضہ یا کم از کم اس کی سرپرستی چاہتا ہے۔ اور اسی طرح ریاست اپنی مضبوطی کے لئے مذہب پر قبضہ یا کم سے کم اس کی مدد چاہتی ہے۔ اور دونوں مل کر عقل پر بند باندھ کر اور اسے زنجیروں میں جکڑ کے بیٹھے رہتے ہیں۔ اس سلسلے میں بہترین صورت تو ظاہر ہے یہ ہونی چاہیے کہ ریاست اور مذہب' طاقت اور ایمان' دونوں عقل یعنی تہذیب کے ضابطے اور تادیب کے زیر اثر رہیں' اور اس کی تعمیرو ترقی کے کام آئیں۔ لیکن عملی طور پر ایسا ہوتا ہے کہ کبھی ریاست مذہب کو ہتھیار بناتی ہے' اور کبھی مذہب ریاست کو' اور دونوں تہذیب کو محدود کر کے اسے آگے بڑھنے سے روکے رکھتے ہیں اس لئے کہ کہیں آزاد عقل ان کی تبدیلی یا تردید کا باعث نہ بن جائے۔ پھر جب مذہب یا ریاست' یعنی ایمان اور طاقت کچھ زیادہ عرصہ عقل (تہذیب) کی قربت سے محروم رہتے ہیں' بلکہ اسے نچوڑ کر' بزدل اور کنگال بنا دیتے ہیں' تب ان کے اپنی بے طاقت اور بے روح وجود کا حال یوں ہوتا ہے جیسے پرانے درخت اندر سے کھوکھلے ہو جاتے ہیں۔ اور صرف تنے کی ظاہری بناوٹ کے سہارے جوں کے توں ایستادہ رہتے ہیں' اور ظاہری دکھاوے کے لئے ان پر ہرے پتے اور ڈالیاں جھولتی نظر آتی ہیں' بالکل اسی طرح جیسے وہ تازہ اور توانا ہوں۔ اس طرح وہ سالہا سال بلکہ بعض صورتوں میں صدیوں تک جھوٹی پائیداری کی جھلک دکھاتے رہتے ہیں ۔ لیکن وہ بے طاقت' بے مقصد محض رسم رواج' کریا کرم اور اداروں کے لمبے چوڑے انتظام میں پھنسے رہتے ہیں۔ اور اس طرح وہ پورے معاشرے کے لئے ایک مصیبت' اپنے خول میں بند خلق خدا' قوم اور سارے اجتماع کے لئے سوائے خواری اور آزار کے اور کچھ نہیں ہوتے۔

مذہب اور ریاست کے یوں یکجا ہونے پر سبقت یا فوقیت دونوں میں سے کسی کو بھی حاصل ہو' ذہنی جمت اور اقتدار پرستی جنم لیتی ہے۔ اس میں طاقت مل جل کر حکمران اور ملا کی صورت میں ایک آستانے پر جمع ہو جاتی ہے' اس نظریے کی بنیاد پر کہ

تمام طاقت کا سرچشمہ کوئی ان دیکھا اصول ہے' جس تک رسائی محدود اور مخصوص ہے۔ اس صورت حال کے باعث تمام خواہشات و جذبات مردہ ہو جاتے ہیں۔ زندگی کے پاس دینے کے لئے' بعد ازاں صرف دو نکتے رہ جاتے ہیں۔ حاکم اور درویش' امیر اور فقیر۔ جس جگہ بھی ان دونوں کی بادشاہت ہے ذہن سے کائناتی یا فطری مطالعے کے لگن ختم ہو جاتی ہے اور تمام امنگیں دم توڑ دیتی ہیں' کیونکہ کائنات ممکنہ آسان اور مستند معنی "دنیا اور آخرت" اور علم کے معنی "الہامی کتاب" اور آدرش کے معنی "روح کی نجات" کے رہ جاتے ہیں۔ مطلب یہ کہ اس صورتحال میں اپنے وجود سے بلند اور اپنے وجود سے باہر انسان نہ تو چڑھ سکتا ہے نہ نکل سکتا ہے۔ مذہب اور ریاست کے اس ذہنی تعطل کے باعث آخر کار ریاست کی آپیشاہی بڑھتی اور مضبوط ہوتی ہے' یعنی طاقت اور محض طاقت' اور وہ پھر مذہب کو ہتھیار کے طور پر استعمال کرتی ہے چاہے مذہب اپنی برتری کی تصدیق میں کتنی ہی مبالغہ آرائی سے کام کیوں نہ لے۔ نیتجتاً" اس اتحاد میں مذہب اور ریاست ایک دوسرے کے زوال کا سبب بن جاتے ہیں اور معاشرے میں اپنے منصبی اور بنیادی افعال پورے کرنے کی اہلیت کھو دیتے ہیں۔ نہ فرد کو ریاست میں جان و مال اور عزت کی ضمانت ملتی ہے' اور نہ مذہب انسان کے لئے ان دیکھے سے امید اور خوف کے موثر وسیلے یا تسلی و تقویت کا کوئی کام دے سکتا ہے۔

جب کسی معاشرے میں مذہب اور ریاست اپنے جمود' تشدد اور تنگ نظری کے اس نکتے پر پہنچ جاتے ہیں' تو معاشرہ بحرانی کیفیت سے دوچار ہو جاتا ہے۔ ایمان اور طاقت جامد ہو جاتے ہیں' اور جامد ہی رہنا چاہتے ہیں۔ لیکن عقل و جذبات اور ولولہ متحرک ہیں اور آگے بڑھنا چاہتے ہیں۔ ان کے آگے بند نہیں باندھا جا سکتا۔ اس گھٹن کے باعث حساس ذہنوں میں کسی جنت کا خواب جلوہ گر ہوتا ہے جبکہ عام آدمی بیزاری اور انتقام کے جوش میں گرفتار ہو جاتے ہیں۔ ایسے میں آگ کے بھڑک اٹھنے اور

دھماکے کو روکنا مشکل ہوتا ہے۔ انسانی فطرت کی نیکی کا اصول کسی بہشت کے خواب پانے اور اپنانے کا یہی احساس ہے' اس کی اچھائی کی علامت کسی موجود جہنم کے خلاف اس کا یہی انتقامی جوش ہے' صاف اور سچا جوش' پرانے کو مٹانے کا اس قدر نہیں بلکہ نئے کو آگے لانے کا یہی جوش عظیم نتیجوں کو جنم دیتا ہے۔ جدید اور اعلیٰ حسن کا یہ لطیف' دلکش اور تیز تر احساس اور اس لاثانی حسن کی منتقلی کا یہ سچا اور خود فروشانہ جذبہ قوموں' ملکوں اور معاشروں کے بحرانی دور میں ہی پیدا ہوتا ہے' اس لئے کہ بحران ہی حالات کی کایا پلٹ میں قدرتی ذریعہ بنتے ہیں' اور بحرانوں میں ہی قوموں کی قسمت کے بنیادی سوالات بھرتے ہیں' اور ان کے حل کے لئے زمین ہموار ہوتی ہے۔ بحرانوں میں کتنے ہی بے جان اور غیر ضروری ادارے ختم ہو جاتے ہیں' جو تاریخ یا روایات کے سبب معاشرے کے وجود سے چپکے ہوئے ہوتے ہیں' جبکہ عام حالات میں وہ آسانی سے ختم نہیں ہوتے۔ بحرانی دور کا کوئی حادثہ یا ہنگامہ حساس ذہنوں کو نقصان نہیں پہنچاتا۔ بلکہ غیر محفوظ حالات اور عدم تحفظ کے دور میں عظیم روحانی قوتیں ایک جھٹکے سے بیدار ہو جاتی ہیں۔ حساس ذہنوں کے مالک' طاقتور اور جاندار مفکر' شاعر اور فنکار' خطرے کی فضا کو اچھا سمجھتے ہیں' کیونکہ ان کے ذہن بڑے اور دقیق تجربات کے باعث پختہ ہوتے ہیں' اور انھیں نیا معیار ملتا ہے۔ وہ زندگی کے بارے میں زیادہ آزاد ار قابل اعتبار فیصلوں تک پہنچتے ہیں۔ اس کے برعکس مکمل طور پر ساکن ماحول میں' ذاتی زندگی کے مفادات اور خوشیاں تخلیقی ذہنوں کو گھن لگا کر کمزور کر دیتی ہیں' اور ان کی عظمت چھن جاتی ہے۔ اس صورت میں محض خام خیالی اور بے غرض قابلیت والے لوگ آگے بڑھ آتے ہیں' اور ان کے نزدیک فن' فکر اور ادب محض ایک تجارت اور سوداگری ہوتی ہے' کیونکہ وہ ہوتے ہی تاجر اور سوداگر ہیں۔ ایسے لوگ بغیر کوئی دکھ اٹھائے اپنی اہلیت سے کہیں زیادہ بڑے ذاتی فائدے حاصل کرتے ہیں' کیونکہ ان کے اندر آگ کے بھڑک اٹھنے کی قدرت ہی نہیں ہوتی' نہ ان میں بیان لیاقت ہی ہوتی

ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ کسی بحرانی صورت حال میں ایسے سطحی اور چھوٹے لوگ تنکے کی طرح حقیر بن جاتے ہیں۔ بحرانوں میں یگانہ صفات کے مالک اور عظیم لوگ ہی مٹتی ہوئی زندگی میں جان ڈال دینے والی تحریکوں کی محرک، واضح نشان، یا اظہار بن کر ابھرتے ہیں۔ ان کے وجود سے ہی تاریک کے ان ادوار کو شان و شوکت نصیب ہوتی ہے، اور یہی شان و شوکت قرض کی صورت میں آئندہ نسلوں کو منتقل ہو جاتی ہے، ماضی کا حال کے کھاتے میں پیمائش سے زیادہ یہ قرض کبھی کم نہیں ہوتا ہمیشہ بڑھتا ہی رہتا ہے، ایک سدا جاری رہنے والا سلسلہ، ایک سدا چلنے والا رستہ۔ اسی یادداشت کو تاریخ کہتے ہیں۔ اس راستے سے انسانی ذہن کو اپنی اہمیت کے شعور کا احساس ہوتا ہے، اسی راستے سے ہی انسان اپنی عظمت اور جوہر سے آگاہ ہوتا ہے۔ انسان، تہذیب کے راستے میں مدد سے آگے بڑھتا ہوا، تمام اشیاء کا ازلی مرکز، دکھ سہنے والا، آگے نگاہ رکھنے والا، جدوجہد کرنے والا، محنت کش۔ آج بھی وہ ایسا ہی ہے جیسا کل تھا، اور ہمیشہ وہ ایسا ہی رہے گا۔ یہ حقیقت ہمیں ہمیشہ یاد رکھنی چاہیے، ورنہ دوسری صورت میں ہم اپنے اعلیٰ روحانی ورثے کی اہمیت کی قدروقیمت نہیں جان سکیں گے۔

شاہ، سچل اور سامی، عظمت کے حقیقی مفہوم میں، سندھی سماج کے عظیم انسان ہیں۔ وہ سندھی سماج کے ایک بڑے بحرانی دور کی پیداوار ہیں وہ ذہنی (روحانی) دنیا کے عظیم تخلیق کار ہیں۔ وہ بے مثال صلاحیت اور اہلیت کے مالک، سندھی سماج کے نئے جنم کے نقیب ہیں۔ وہ مفکر، شاعر اور فنکار بھی تھے۔ دوسروں کے لئے جینے، اور مفاد عام کے لئے سرگرداں رہنے کے ساتھ ساتھ انہوں نے اپنی پوری زندگی ایک ہی مقصد اور نصب العین کے لئے وقف کر دی تھی۔ انہوں نے اپنے عہد اور اپنی دنیا کی سچی امنگ اور روح کو سمجھا۔ انہیں معلوم تھا کہ اہل سندھ کیا چاہتے ہیں، ان کی زندگی میں کیا ضروری، اہم اور بنیادی باتیں ہیں۔ انہوں نے لوگوں کو صحیح راستہ دکھایا۔ وہ راستہ جس پر انہیں ہمیشہ کے لئے چلنا ہے، آگے بڑھنے کا اور سلامتی کا راستہ، جس کے علاوہ

کوئی دوسرا راستہ ان کی سلامتی کے لئے ممکن نہیں۔ وہ اپنے ساتھ کوئی خواب، کوئی فکر، اور طرز حیات لے کر آئے تھے، جو کہ ان کے ملک، قوم اور سماج کے لئے آب حیات تھی ہی، پر وہ تمام عالم انسانی کے لئے بھی خیر و برکت، سکھ اور عافیت کا ایک پیغام اور کامل نسخہ تھے۔ شاعر اور فنکاروں کی ایک عادت ہے کہ وہ جن چیزوں کو کچھ اسباب کے باعث اہم سمجھتے ہیں دائمیت دے کر لافانی بنانا چاہتے ہیں۔ عظیم لوگوں کو اپنے بعد آنے والی نسلوں کی کوئی خبر تو نہیں ہوتی لیکن ان کا انہیں کوئی خیال بھی ہوتا ہے اس سلسلے میں بھی یقین سے کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ جبکہ وہ اپنے عہد کے ساتھ وابستہ ہیں اور اس کی روح سے آشنا ہوتے ہیں، اس کے اصل دکھ کی بنیاد کو جانتے ہیں اور اس کو اپنے روح کی اتھاہ گہرائیوں میں وہ محسوس کرتے ہیں، اور پھر اپنے ان عمیق اور انمول احساسات کو دائمیت دے کر لافانی بنا دیتے ہیں اور اپنے ملک، قوم اور سماج کے لئے اور ان کے توسط سے تمام دنیا کے بعد ان کے وہ احساسات پیہم دوا کا کام دیتے ہیں۔ شاہ، سچل اور سامی بھی اپنے ملک اور قوم کے ایسے ہی حکیم اور رہنماء ہیں۔ انہوں نے سندھی سماج کی مجبوری اور محرومی کو پہچانا جس نے اسے عصری بحران سے دوچار کیا تھا، اور انہوں نے ان کے لئے نجات کی راہ تجویز کی۔ سندھی سماج کو اپنے ان عظیم بزرگوں اور ہمیشہ زندہ رہنے والے رہنماؤں کے متعین کردہ راستے کو پہچاننا ہے اور اس پر چلنا ہے۔ ممکن ہے بلکہ یقین سے یہ کہا جا سکتا ہے کہ سندھی معاشرہ اس راستے پر مکمل طور پر نہ چلنے اور اسے چھوڑ کر دوسرے راستے کو اختیار کرنے کے باعث ہی آج اتنی اور اس قدر دشواریوں میں مبتلا ہے، اور آج یا کل، جلد یا بدیر، لوٹ کر اس ہی راستے کو پہچان کر اور اسی رخ پر آگے بڑھتے ہوئے وہ خود کو پہچان سکتا ہے اور اپنی پہچان کرا سکتا ہے، اور اپنے لیے اور بنی نوع انسان کی لئے، خود کے ہونے یا نہ ہونے کی اہمیت کو سمجھ سکتا ہے، ثابت کر سکتا ہے اور منوا سکتا ہے۔

شاہ، سچل اور سامی سندھ کی تاریخ میں ایک ہی دور سے تعلق رکھتے تھے بلکہ کم

و بیش ہم عصر شاعر تھے۔ سچل اور سامی تو تقریباً ہم عمر بھی تھے۔ سچل ۱۷۲۹ء میں اور سامی ۱۷۳۰ء میں پیدا ہوئے۔ سچل نے تقریباً ایک سو سال کی عمر پائی اور ۱۸۲۹ء میں ان کا انتقال ہوا۔ سامی ۱۲۰ سال کی عمر میں ۱۸۵۰ء میں انتقال کر گئے۔ درازا اور شکارپور کے درمیان صرف دو دن کا پیدل سفر ہے، ور اگر سواری استعمال کی جاتی تو ایک دن کا بھی سفر نہیں ہے۔ پھر ایک سو سال کی مدت تھوڑی مدت بھی نہیں جبکہ وہ عام آدمی بھی نہ تھے کہ ایک دوسرے کی باتوں سے ناواقف ہوتے۔ جب یہ دونوں ۲۲ سال کے نوجوان تھے شاہ کا انتقال ہوگیا۔ سچل سرمست کے لئے تو شاہ عبداللطیف نے خود کہا تھا۔ "ہماری پکائی ہوئی ہنڈیا کا ڈھکنا یہ کھولے گا" یعنی ہمارے پیغام اور خیالات و افکار کی وضاحت اور پرچار کرے گا۔ اپنے اس پیغام اور خیلات وافکار کی طرف اشارہ کرتے ہوئے، انہوں نے کہا کہ "تو نے جسے ابیات سمجھا وہ تو "آیات" ہیں۔ اور یہ آیات ہی تجھے منزل مقصود تک لے کر جائیں گی، بالکل اسی طرح جیسے ایران کے عظیم صوفی شاعر مولانا رومی کی مثنوی کے متعلق کہا گیا کہ "یہ تو زبان میں قرآن ہے جس کا مغز استخواں سے الگ کر کے فارسی بولنے والی ایرانی قوم کی رہبری کے لئے اس کے سامنے لاکر رکھا گیا ہے۔" پھر ساتھ ہی سامی "ویدانت" کا پرچار سندھی زبان میں کر رہے تھے گویا ایک طرف شاہ اور سچل تھے، جو قرآن کی تفسیر و ترجمہ کے ذریعے اہل سندھ، ہندو اور مسلمانوں دونوں، کی روحانی اصلاح کر رہے تھے، اور دوسری سامی تھے جو یہ کہہ کر کہ ویدن جو وچار تو کھے سندھی میں سنایاں (آؤ میں، میں ویدوں کی حکمت تمہیں سندھی میں سناتا ہوں) ہندو مذہب اور اس کی مقدس کتابوں اور افکار سے سندھی سماج کو باخبر کرا رہے تھے۔ عربی اور سنسکرت زبانیں جن میں یہ مقدس صحائف ہیں، مشکل زبانیں تھیں اور ہیں۔ یہ زبانیں ہندو اور مسلمان دونوں کے لئے سمجھنا مشکل تھیں، اور اس سے زیادہ مشکل انہیں اپنے آسمانی صحیفوں کو سمجھنے میں ہو رہی تھی اس لئے کہ ان کی نظر میں تمام حق ان کے اپنے اپنے صحائف میں تھا، جن کا ایک ایک لفظ سچا اور برحق

تھا، جس میں تبدیلی ناممکن اور ان پر حرف گیری ممنوع تھی۔ اسی دور میں انہی مقدس صحیفوں کے پیشہ ور سمجھانے والے (ملا، پنڈت) بھی موجود تھے جنہوں نے ان کی وضاحت اس طرح کی کہ سمجھانے والی بات کو گڈ مڈ کر کے اپنی مرضی اور منشاء کے مطابق قرآن، اور ویدانت کے الفاظ کو توڑ مروڑ دیا۔ اور ایک دوسرے پر لعن طعن کر کے، سندھی سماج میں انسانی ہم آہنگی اور مفاہمت کے عوض تفریق اور فساد کا سبب بنے رہے۔ ان میں سے ایک گروہ نے ریاست پہ قبضہ کر کے اس کی طاقت کو اپنے ہتھیار بناکر چاروں طرف ذہنی پستی اور گھٹن کی دنیا قائم کر رکھی تھی۔ شاہ، سچل اور سامی سندھی سماج کو اس تفریق و فساد اور ایسی روحانی گھٹن اور پستی سے بچانا چاہتے تھے، اور سندھ سماج میں امن و اتحاد، ذہنی آسودگی، اور ضمیر کی آزادی کی دنیا آباد دیکھنا چاہتے تھے، نئی دنیا کے اس حسین خواب کی تکمیل کا احساس اور بے دھڑک جوش نے انہیں تمام عمر مضطرب اور کوشاں رکھا، اور وہ اس کے لئے اپنے وقت سے اپنی تمام توجہ کے ساتھ اپنے ناتا نبھا کر انسانی تہذیب کے اسی ایک بہترین اصول کو سمجھا کر نہ صرف سندھی سماج کے بلکہ بنی نوع انسانی کی تاریخ میں عظیم اور امر انسان بن گئے۔

لوگ کیسے اور کب ریاست بن جاتے ہیں اور کیسے اور کب قوم بن جاتے ہیں، انسانی تاریخ کا یہ انتہائی بنیادی اور گھمبیر سوال ہے۔ ویسے تو ملکوں، معاشروں اور قوموں کی غلامی کے زمانے مجموعی طور پر ان کی زندگی کے بحرانی دور ہوتے ہیں، کیونکہ ان ہی ادوار میں ان کا وجود خطرے میں ہوتا ہے اور وہ آزمائش میں مبتلا ہوتے ہیں، لیکن خاص طور پر جب وہ اپنی آزادی کی جدوجہد میں مصروف ہوتے ہیں ان کی تاریخ کے بنیادی طور پر بحرانی اور اہم ترین ادوار وہ ہی ہوتے ہیں۔ شاہ، سچل اور سامی کا دور (تقریباً ۱۷۰۰ سے ۱۸۵۰ء) اسی طرح سندھی سماج کی تاریخ کا اہم ترین اور بنیادی طور پر بحرانی دور تھا۔

نویں صدی کے نصف سے لے کر سولہویں صدی کے شروع تک کم و بیش سات

سو سال تک سندھی ریاست سندھیوں کے قبضے میں رہی۔ پانچ سو سال سے کچھ زیادہ سومرو خاندان کے ہاتھ میں اور تقریباً دو سو سال سمہ کے قبضے میں رہی۔ سندھی تاریخ کا یہ عہد سندھی معاشرے کی بنیادی نمو کا دور تھا۔ سندھ کے تقریباً تمام تاریخی اور نیم تاریخی قصے، قابل فخر واقعات، کتھائیں، لوک کہانیاں، لوک گیت، اور قابل تحسین سورما اسی آزاد ریاستی دور سے تعلق رکھتے ہیں۔ سندھی تاریخ کے اس دور کو بجا طور پر سندھی معاشرے کے تہذیبی غلبے کا ترجیجی دور کہا جاسکتا ہے۔ اس عہد کے سندھی سماج میں مذہب اور ریاست دونوں نے سندھی تہذیب کی نشونما کا کام انجام دیا۔ ملک کی سرحدوں کی حفاظتی تدابیر، معاشرتی خوشحالی کی کوششیں، سندھی کردار کی ذہنی پرورش اور اخلاقی تعمیر و تکمیل، سندھی معاشرے کی تاریخی شکل اور ساخت جو اس دور میں بنی اس کی مثال سندھ کے تاریخی ادوار میں کوئی اور نہیں ملتی ہے۔ سندھی تاریخ کا یہ غیر معمولی اہمیت کا حامل دور ۱۵۲۰ء میں ختم ہو گیا۔ اس کے یوں ختم ہو جانے پر اہل سندھ نے اپنا قیمتی خون بہایا۔ جس میں سندھی معاشرے کے ہر طبقے کا خون شامل تھا۔ عظیم مقصد کے حصول کی خاطر قربانی کے طویل سلسلے میں انہوں نے ایک بالکل ہی نادر اور انوکھے مثال کا اضافہ بھی کیا، جو کہ ان کے ایک وطن دوست مذہبی عالم مخدوم بلاول کی شہادت کا مثال تھا، جنہوں نے دشمن کے ہاتھوں کولھو میں پس کر اپنی جان قربانی دی۔ ماضی میں بھی سندھ کے مذہبی قائدین نے وطن عزیز کے لئے ایک مو[illegible] اپنے سر دیئے تھے۔ ۳۲۵ قبل مسیح میں جب یونان کے سکندر اعظم اپنی فتح سے فوج سمیت سندھ کی حدود میں داخل ہوا تو اسے کسی نے بتایا کہ وہاں ایک ایسی موجود ہے جو بیرونی حملہ آوروں کے خلاف مقامی لوگوں کو منظم کرتے ہے۔ وہ برہمن تھے جو مقامی لوگوں کے ساتھ خود بھی قربانی سے دریغ نہ کرتے تھے۔ دو ا واقعات تاریخ میں موجود ہیں۔ ایک واقعہ سمہ قبیلے کی ریاست سندیمن (سیوھن ہے، جہاں فتح کے بعد سکندر اعظم نے برہمنوں کے قتل عام کا حکم دیا کیونکہ "ا۔

علوم یہ تھا کہ انہوں نے ہی لوگوں کو مقابلے کے لئے ابھارا تھا"۔ دوسرا واقعہ ملسیکانس (ماچھی) قبیلے کی شکست خوردہ راناکا ہے جسے "اس کی ریاست لور کے چوراہے پر تمام ہمنوں کے ساتھ پھانسی پر چڑھانے کا حکم دیا گیا کیونکہ انہوں نے ہی اسے مقابلے کے لئے آمادہ کیا تھا۔" لیکن ان بے مثال قربانیوں کے باوجود بھی سندھ کی الگ الگ یاستیں نہ یونانیوں کے حملے سے محفوظ رہیں اور نہ ہی دو ہزار سال بعد ایک سمہ جام زیر حکم سندھ کی مرکزی ریاست ہی ارغون وحشی حملہ آوروں سے بچ سکی۔

کوئی بھی سماج، ملک اور قوم بیرونی حملہ آوروں سے شکست نہیں کھا سکتی اور ت کھانے کے بعد زیادہ عرصہ مجبور اور محکوم نہیں رہ سکتی جب تک کہ اس میں ی اندرونی کمزوری یا نقص نہ ہو۔ اور وہ کمزوری یا خرابی یقیناً" اس کے اندرونی نفاق اور انتشار کی کوئی صورت یا نتیجہ ہو گی۔ ریاست، مذہب اور تہذیب معاشرے یا سماج کے یہ تین شعبے، سماج کی سلامتی یعنی اس کے اتحاد اور مضبوطی کے ضامن ہوتے ہیں۔ بلکہ ان کا منصبی کارج ہی یہ ہوتا ہے۔ ریاست اپنا یہ کارج ملک اور سماج کی حفاظت کرنے سے، اور فرد واحد کی پسند نہ پسند کو اجتماعی پسند نہ پسند سے ملا کر ایک بنانے سے، قانون اور انصاف کے پورے نفاذ سے، طبقات اور گروہوں کے سلسلے میں اپنی غیر جانبداری کو قائم رکھتے ہوئے ان کے درمیان باہمی برداشت اور رواداری کی فضا قائم کرنے سے، ادا کرتی ہے۔ تہذیب اپنا یہ کارج ذہنی تخلیقات یعنی فلسفہ، شاعری اور دوسرے فنون لطیفہ کے میدانوں میں اپنی کاوشوں اور جسمانی مشقت کی وسیع پیداواری، اور تعمیری کوششوں کے ذریعے ادا کرتی ہے۔ لیکن چونکہ مخصوص ریاستیں اور مذاہب صرف چند افراد (یا گروہوں) کی ذاتی کوششوں اور چند مخصوص واقعات کا فوری نتیجہ ہوتے ہیں اور دوسری بات یہ کہ ریاست اور مذہب اپنے زور اور عقیدہ (طاقت اور ایمان، اقتدار اور اعتقاد) کے گھمنڈ میں عدل اور رواداری کے توازن سے اکثر باہر نکلے ہوئے ہوتے ہیں، اسی لئے وہ سماج میں امن و اتحاد کا ذریعہ بننے کی بجائے ان کی تفریق

اور نفاق کا سبب بن جاتے ہیں۔ خاص طور پر جب وہ محض ایک دوسرے کی دیکھا دیکھی میں یا غلامی میں ہوتے ہیں، تبھی تشدد اور تعصب سے تمام معاشرے میں فساد کر دیتے ہیں۔ یوں وہ معاشرہ ظاہری طور پر مضبوط اور مستحکم نظر آتا ہے، لیکن بیرونی دشمنوں کے مقابلے میں کمزور اور زیر دباؤ رہتا ہے۔ ریاستوں اور مذاہب کے برعکس، تہذیب طویل زمانوں کے گزرنے سے قوموں اور سماجوں کے ذہن کے کھلنے، پختہ ہونے اور قدم بقدم آہستہ آہستہ رونما ہونے والی ترقی و ارتقا کی پیداوار ہوتی ہے، اس لئے تہذیب اپنی عمل پیرائی میں کبھی بھی اپنے سماج کے نفاق یا تفریق کا باعث نہیں بنتی، بلکہ ہمیشہ اس کے اتحاد اور مضبوطی کے لئے صاف ستھری اور پختہ راہ فراہم کرتی ہے اسی لئے یہ کہا جا سکتا ہے کہ ریاست اور مذہب کے بغیر بھی کسی قوم یا معاشرے کے وجود کا بالآخر تصور ممکن ہے، پر تہذیب کے بغیر وہ کسی بھی صورت میں ممکن نہیں ہو سکتا۔

کوئی ریاست اور کوئی مذہب جب کسی قوم یا سماج کی تہذیب کے دفاع اور فروغ کی کوشش میں مصروف ہوتے ہیں یا کم از کم اس سے ہم آہنگی یا مصلحت میں ہوتے ہیں، تب اور صرف تب ہی وہ اس قوم یا معاشرے کی قدر اور فرمانرداری کے حقدار سمجھے جاتے ہیں۔ کیونکہ صرف اسی صورت میں وہ اس کے وجود کے بہی خواہ، مدد گار اور محافظ بن سکتے ہیں۔ اسی خیال کے تحت ہر ریاست کو اور ہر مذہب کو بھی اپنی اپنی قومی حیثیت اور خاص معاشرتی رنگ کو اختیار کرنا پڑتا ہے۔ بدھ مت نے چین، جاپان اور برما اور دوسرے مشرق قریب کے ممالک میں سے تقریباً ہر ملک میں مقامی سماجی رنگ اختیار کیا جو اس کا قومی رنگ تھا۔ مسیحیت نے یونان، روس ایشیائی کوچک اور خاص طور پر سولھویں صدی کی اصلاحی تحریک کے بعد یورپ کے تقریباً ہر ملک میں مقامی رنگ اختیار کیا جو اس کا قومی رنگ تھا۔ فتح عرب کے بعد ایران نے اسلام قبول کیا اور اسے خاص ایرانی رنگ دے کر اپنا قومی مذہب بنایا اور اس طرح اپنے سیاسی اور تہذیبی امتیازات اور خودمختاری کو بحال کیا اور قائم رکھا۔ بین الاقوامی تاریخ میں ایسی کئی

مثالیں موجود ہیں کہ جب اقوام اور معاشرہ کو اپنے فاتحین کے مذہب کو ماننا اور اپنانا پڑا، تو اسے اپنی مقامی حالت اور حیثیت سے ہم آہنگ کر کے اپنے تہذیبی غلبے کا رنگ دے کر اپنا بنایا۔ اسے بدعت یا تجدید کہنے سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ حقیقتاً بدعت تا تجدید سے کوئی "قومی" مذہب بھی بچا ہوا نہیں ہے کیونکہ کوئی بدعت کوئی تجدید میں کسی مذہب میں صرف اسی صورت میں ہی آتی ہے۔ جب وہ اپنے تعصب اور جمود کے باعث اپنے قوم اور معاشرے کی آزاد اور متحرک تہذیب سے قدم بقدم نہیں رہ سکتا، بلکہ اس کی راہ کی رکاوٹ بن جاتا ہے۔ مطلب یہ کہ ریاست اور مذہب کو اپنی رضا سے یا مجبوراً بہرصورت اپنی ہم عصر یا طفیلی ہو کر رہنا پڑتا ہے اور اسی صورت میں سماج کے یہ تینوں شعبے ہم آہنگ رہ سکتے ہیں اور اس کے اتحاد اور مضبوطی کی ضمانت بنتے ہیں۔

بتیس سو سال پہلے یونانی حملے کے وقت اہل سندھ قوم تو درکنار، ریاست بھی نہیں بن سکے تھے۔ وہ قبائلی نفاق میں مبتلا تھے۔ ان کے متذکرہ بالا دو قبائل ماسیکانس (ماچھی) اور سمبس (سمہ) کے علاوہ اس کی تاریخ میں پانچ دوسرے قبائل کے نام بھی آتے ہیں، جو سب علیحدہ علیحدہ تھے، اور علیحدہ علیحدہ ہو کر لڑے، بلکہ اس وقت بھی وہ آپس میں متصادم رہے اور علیحدہ علیحدہ مارے بھی گئے۔ ان کا وطن دوست مذہب اور علیحدہ علیحدہ ریاستیں بیرونی حملہ آوروں کے بالمقابل کسی کام نہ آئے۔ عربوں کے حملے کے وقت اہل سندھ کے پاس اپنی ریاست تو تھی، لیکن جس زور سے پہ وہ قائم کی گئی تھی اسے وہ اپنی قوت نہ بنا سکے تھے۔ یعنی اہل سندھ خود کو ابھی قوم نہیں بنا سکے تھے۔ خاص طور پر مذہبی تفریق ان کی اندرونی زبوں حالی کا سبب بنی ہوئی تھی۔ بدھ مت اور برہمن واد، اپنی اپنی خود پسندی اور اپنے اپنے تعصبات کے باعث ایک دوسرے پر نگاہیں جمائے بیٹھے ہوئے تھے۔ اور چھوٹی چھوٹی راج دھانیوں کے چھوٹے چھوٹے نائب سردار، کچھ اعتقادی گھمنڈ، خوف اور کچھ اقتدار کی کشش اور خواہش میں

اپنی اپنی مختصر حکمتوں کا شکار ہو گئے۔ یوں سندھ کی مرکزی ریاست اپنے مذہبی اور سیاسی نفاق کے باعث اندر سے کھائی ہوئی کھوکھلی دیوار بنی موجود رہی جسے باہر سے صرف ایک ہاتھ دکھانے کی دیر تھی۔ سولہویں صدی کے شروع میں ارغونوں کے حملے کے وقت سندھ کا حکمران شاہی گھرانہ ایک بار پھر اقتدار کی خانہ جنگی میں مشغول تھا۔ اور سندھ کی ریاست اپنی طاقت اپنے ہی خلاف استعمال کر رہی تھی۔ ریاستی سربراہ جام فیروز سندھ کی عالی مقام جام نندہ کے پیراں سالی کا نالائق بیٹا اپنے اور پرائے لوگوں کے خوف میں مبتلا، خود سے بیزار، ذاتی اور عوامی مفاد سے بے نیاز صرف اپنے ذاتی بچاؤ کے لئے ہاتھ پاؤں مار رہا تھا۔ اور اس جدوجہد میں کبھی اپنے لوگوں کے ساتھ کبھی دوسروں لے ساتھ مل کر سندھ کی شکست اور خواری کا سبب بن گیا۔ ہم مذہبی کا چوغہ پہنے حملہ آور ہونے والے ارغونوں سے جیکل جیکل نہ وہ خود مقابلہ کر سکا، نا ہی اس کے بزرگ اتالیق دریا خان اور اس کے بہادر بیٹے کچھ کر سکے۔ اور نا ہی اس کے تخت و تاج کے دعویدار چچیرے بھائی جام صلاح الدین مشترکہ دشمن سے نبرد آزما ہو سکے۔ اور اس طرح مرکزی حوصلہ افزائی کے قطعاً عدم موجودگی میں سندھ کے لوگ اپنے وطن کو دشمنوں سے نہ بچا سکے۔ وطن کے دفاع کی اس عبرتناک جنگ میں سندھ کا ہر طبقہ اور ہر قبیلہ ایک ایک کر کے لڑتا رہا، اس میں ان سے شامل وطن دوست مذہبی حلقہ بھی انہیں بچا نہیں سکا۔ دراصل عین اس آزمائشی دور میں مذہب، ریاست (حکومتی اقتدار) ہی کی طرح، اہل سندھ کے اتحاد اور قوت کا نہیں بلکہ اس کی کمزوری اور نفاق کا سبب بن گیا۔ قاضی قاضن اور ان کی ساری مہدوی ٹولی کے مذہبی سربراہان، شمالی سندھ کے مرکزی شہر سکھر کے سادات اور دوسرے کتنے ہی شیخ، مشائخ نے اپنے وطن اور اپنے لوگوں سے غداری کی اور حملہ آور دشمنوں کے لئے جاسوسی اور روحانی نثاریوں کا ہر اول گروہ اس کے علاوہ تھا۔ مطلب یہ کے سولہویں صدی کا سندھی معاشرہ اپنی مضبوط تہذیبی روایتوں کی موجودگی میں اور پختہ محب وطن ریاست رکھتے

ہوئے بھی صرف اپنی اندرونی کمزوری کے باعث جس کی بنیادیں سیاسی اور مذہبی خلفشار میں تھیں خود کو شکست اور غلامی سے محفوظ نہ رکھ سکا۔

ارغونوں کے ہاتھوں سندھ کی اس فتح کو "خرابی سندھ" کہہ کر اس دور کے عالموں نے اس سے سندھ کی بربادی کی تاریخ (۹۲۷ھ ۱۵۲۰ء) نکالی ہے۔ "تاریخ معصومی" کے مطابق بارہ محرم کو ارغونوں کا لشکر ٹھٹے میں داخل ہوا اور "مغل ۲۰ تاریخ تک سہر میں لوٹ مار کرتے رہے اور وہاں کے لوگوں کو ذلیل کرتے رہے جس سے آیت مقدسہ ان الملوک اذا ادخلو اقریتہ افسروھا (بادشاہ جب کسی شہر میں داخل ہوتے ہیں تو اسے ویران کر دیتے ہیں) کی وضاحت آنکھوں کے سامنے آگئی۔" جب دشمنوں کے لشکر نے ٹلٹی کا شہر فتح کیا، تو اسی تاریخ دان کا کہنا ہے "تین دن ٹلٹی میں رہ کر مغلوں نے اس کے مکینوں کو تباہ برباد کر دیا۔" باغبان (موجودہ سہون بوبک علقے کی اراضی) میں پہنچ کر ارغون افواج نے "ماچھی قوم، جنہوں نے اطاعت اور فرمانبرادی سے انکار کر دیا تھا، ان سب کو قتل کیا اور ان کے مال و اسباب اور مویشیوں کی لوٹ مار کر کے گھروں کو قلعوں کو مسمار کر دیا۔" سندھ کے بلوچوں کے بارے میں سندھ کی فاتح شاہ بیگ ارغون، جن کے متعلق تاریخ معصومی کا کہنا ہے کہ "اکثر اوقات وہ عبادت اور تقوے میں مشغول رہتا تھا اور علماء و مشائخ کی مجالس میں جاتا تھا۔" اور مرنے کے بعد جس کی لاش مکہ شریف کے جنت المعلیٰ میں دفنانے کے لئے پہنچائی گئی۔ اس نے اپنے گروہ سے "صلح و مشورے کے بعد فیصلہ کیا کہ اس قوم کی آگ کو تلوار کی دھار سے بجھانا چاہیے۔ پھر طے یہ ہوا کہ ہر گوٹھ (گاؤں) میں تجربیکار لوگوں کی ایک جماعت بھیجی جائے جو کچھ مدت ان لوگوں کے درمیان رہنے کے بعد ایک مقررہ وقت پر ان پہ حملہ کر کے انہیں ختم کر دے، اس طرح ہر آبادی کے لئے ایک جماعت مقرر کی گئی جو مقررہ وقت کے انتظار میں رہی اور جب وقت آیا تو اپنی تلواریں نکال کر اس بدبخت قوم کو ختم کر دیا۔ اس طرح ایک ہی وقت میں بلوچوں کی ۴۲ آبادیوں کے

لوگوں کو قتل اور برباد کر دیا گیا"۔ ۱۵۲۷ء جنوری میں ایک سال کے گھیرے کے بعد ارغون جب ملتان کے قلعے کو توڑ کر اندر شہر میں داخل ہوئے تو داخل ہوتے ہی نہایت بے دردی سے قتل و غارت گری اور لوٹ مار شروع کر دی۔ سات سال سے لے کر ۷۰ سال تک کی عمر کے لوگوں کو قید کیا اور ملتانیوں پر قیامت برپا ہو گئی۔ کچھ لوگوں نے بزرگوں کی خانقاہ میں پناہ لی' لیکن دس بارہ دن شہر میں لوٹ مار مچانے کے بعد جب "ترخان" نئی افواج لے کر وہاں پہنچا اور پناہ گزینوں کو جان سے مار کر خانقاہوں کو آگ لگا دی اور دیواروں کو خون سے رنگ دیا۔ ۱۵۳۸ء میں مرزا شاہ حسن' ہمایوں کے بلانے پر گجرات گئے۔ پٹن کے آس پاس قیام کیا اور اس کے ایک سپہ سالار سلطان محمود نے احمد آباد پہنچ کر گجراتیوں کا مال واسباب لوٹا جس میں بڑی تعداد میں سامان کپڑا نقدی اور سونا ملا"۔ گجرات سے شاہ حسن نے' "رادھن پور" کے راستے سے واپس آتے ہوئے جاڑیجہ اور سوڈھا قبائل کا قتل عام کیا اور لوٹ مار کر کے ان کو برباد کیا۔ اسی مرزا شاہ حسن کے لیے بھی وہی "تاریخ معصومی" کہتی ہے کہ "جو بھی مقدمات ان کے پاس پیش ہوئے تھے' وہ اس سلسلے میں شرع سے رجوع کرتے' سادات' مشائخ اور علماء کا بے حد احترام کرتے تھے"۔ اوران کی جسد خاکی کو بھی تدفین کے لئے مکہ معظمہ لے جایا گیا جہاں آپ "جنت المعلیٰ" کے قبرستان میں اپنے باپ کے پہلو میں دفن ہوئے۔

تاریخ کی یہ عالم آشکار حقیقت ہے کہ مذہب کسی ملک' قوم یا سماج کو کسی دوسرے اور ملک' سماج اور قوم کی پیش قدمی' لوٹ مار غلامی سے بچانے کا کام نہیں دیتا چاہے پیش قدمی اور لوٹ مار کرنے والی قوم ہم مذہب قوم ہی کیوں نہ ہو۔ مذہب کسی ایک قوم کو دوسری قوم پر حملہ کر کے لوٹ مار کرنے اور غلام بنانے سے روکنے کا کام نہیں دیتا۔ چاہے دوسری قوم ہم مذہب ہی کیوں نہ ہو۔ پیش قدمی لوٹ مار اور بالادستی یہ اجتماعی طاقت' اس کے انتظام واستعمال کے مسائل ہیں۔ یعنی یہ ریاست کے عملاً دائرہ کار میں آتے ہیں۔ خالص مذہب (کسی بھی مذہب) کا یعنی کسی بھی نظریے میر

ایمان اور اعتقاد کا ان سے کوئی واسطہ نہیں۔ بلکہ اکثر ایما اور اعتقاد' کمزور اور امن پسند قوم میں جاسوس' غدار اور "پانچویں کالم" کے لوگ پیدا کر دیتا ہے' جن کو اسی عقیدے والی طاقتور اور جابر قوم اپنے جنگی مقاصد کے لئے استعمال کرتی ہے۔ سندھ کی تاریخ نے محمود غزنوی کے منصورہ پر حملے اور اس کو نیست و نابود کرنے سے لے کر اور خاص کر ارغونوں کے حملے سے لے کر ۱۷۳۷ء میں مغلوں کے دور کے اختتام تک اور پھر نادر شاہ'احمد شاہ ابدالی' مدد خان اور شاہ شجاع کے حملوں کی صورت میں اسی بنیادی حقیقت کا کھلم کھلا ثبوت فراہم کیا ہے۔

قریب قریب پون صدی ارغونون' اور ان کے شریک کار ترخان قبیلے کے مغل' اپنے ہم مذہب سندھیوں کو کچلتے رہے لوٹتے رہے۔ اس دوران انہوں نے گوٹا سے عیسائی پر تگیز غنیم کو بلوا کر بھی ٹھٹھہ کو لٹوایا' شہر کو آگ لگوائی اور قتل عام کروایا۔ آخر کار ۱۵۹۱ء میں سندھ کو براہ راست دہلی کے مغلوں نے اپنی شاہی جاگیر بنا لیا۔ وہاں کے سب مغل بادشاہ خود کو "غازی" کہلواتے تھے' اور بعد مرگ "خلد آستانی عرش آشیانی" وغیرہ کہلوائے۔ انہی کے دور اقتدار میں غلام سندھ کی مسلمان رعایا کا جو حال تھا وہ بھی قابل سماعت ہے۔ جہانگیر نے اپنی "تزک" میں اپنے ٹھٹھہ کے نواب "مرزا رستم" کے لیے لکھا ہے کہ "اس نے لوگوں پر ایسے بے تحاشا ظلم ڈھائے کہ چاروں طرف خوف و ہراس پھیل گیا۔ اس کی دوسری بہت سی خامیاں بھی سننے میں آئی ہیں۔" اس کے ایک اور مغل نواب فوج علی کے بارے میں جو بکھر کے زیرانتظام حکومت کی ایک جاگیر کا حاکم تھا۔ "ذخیرۃ الخوانین" میں بیان کیا گیا ہے کہ "اس کے ہاں پانی کی دو کڑاہیاں جلتی آگ پر رکھی ابلتی رہتی تھیں اور جو بھی چور یاسادھ' ظالم یا مظلوم' قصور وار یا بے قصور ہاتھ لگتا' اس کے ہاتھ پاؤں بندھوا کر ان کڑاہیوں میں پھنکوا دیتا تھا۔ جو وہیں پر اس میں جل کر مرجاتے۔ تقریباً ایک ہزار لوگ اس خطے میں اس طرح ہلاک کروائے۔ کمینگی اور لاپرواہی میں اس شخص جیسی اور مثال نہیں

ملتی۔" شاہ جہان کے دور حکومت کے ایک نواب احمد بیگ' جس کی راجدھانی سیون
تھی' کے بارے میں بتایا گیا ہے کہ وہ ایک انتہائی نااہل' ست اور کاہل شخص تھا جس
نے اپنی حکومت کی باگ ڈور اپنے ایک ظالم اور سفاک بھائی مرزا یوسف کو سونپ دی
تھی۔ جو فطری لحاظ سے انتہائی پست' ذلیل' بے رحم اور بے ہودہ شخص تھا...... وہ
اتنا سفاک تھا کہ حجاج بن یوسف جیسا ظالم بھی اس کے سامنے ایک ادنیٰ شاگرد کی
حیثیت رکھتا تھا۔ اس نے اپنے ظالم اور کٹھور پن سے پورے صوبے کو ہلا کر رکھ دیا
تھا۔ وہ روزانہ شہر کے بے قصور لوگوں کو پکڑوا کر انہیں اتنے کوڑے لگواتا کہ اکثر کی
کھال اتر جاتی اور وہ مر جاتے۔ یوں دو تین سو بے گناہوں کا مرنا اس کے لئے روزانہ کا
معمول تھا۔ صوبے میں جس بھی مالدار شخص کے بارے میں اس کو علم ہو جاتا تو اس پر
تہمت لگا کر اپنے پاس بلواتا' پھر معمولی سوال جواب کے بعد اسے کوڑے لگواتا پھر اس
کا مال واسباب ضبط کر لیتا۔ اس کا یہ سلوک صرف مردوں تک محدود نہ تھا بلکہ مالدار
عورتوں کے ساتھ بھی یہی سلوک روا رکھتا...... پورے علاقے میں جس کے پاس بھی
قیمتی اور بہترین اونٹ دیکھتا اس سے جبری چھین لیتا اور اپنے شتر خانے میں داخل کر
لیتا...... راستوں کی ہر منزل پر اور دریاؤں کے ہر گذر گاہ پر اس نے اپنے کارندے
کھڑے کر دیئے تھے جو ہر آنے جانے والوں سے بے سبب ہی جرمانے اور محصول کے
نام پر پیسے اینٹھتے' یہاں تک کہ خالی خولی راہ گیر بھی ان کے ہتھ کنڈوں سے محفوظ نہ
تھے۔ ایک گاؤں سے دوسرے گاؤں تک جانے کے لئے بھی راہ داری لینی ضروری تھی
جس کے لیے روپے ادا کرنے پڑتے تھے۔ اگر کسی کو اپنے کسی رشتہ دار کے انتقال کی
خبر دور دراز کے رشتہ داروں کو کرنی ہوتی تو وہ بھی بغیر پیسے ادا کئے' اور راہ داری لئے
بغیر ایک قدم باہر نہیں نکل سکتا تھا...... دریا میں خالی کشتیوں پر بھی محصول واجب الادا
تھا' سوداگروں کی مال بردار کشتیوں اور جہازوں پر ہر طرح کی مصیبتیں نازل ہوتی
تھیں۔ کئی دنوں تک ان کو بلا وجہ روکے رکھا جاتا تاکہ وہ یا اپنا سامان کوڑیوں کے مول

سیون میں بیچیں یا سوداگر تنگ آ کر اپنی جان چھڑانے کے لئے مرزا یوسف کو بھاری
رشوتیں اور قیمتی تحائف نذر کرنے پر مجبور ہو جائیں۔ پورے ملک کے چوروں اور
ڈاکوؤں کو اس نے اپنے پاس پناہ دے رکھی تھی اور ان سے ملک میں چوری کرواتا'
ڈاکے ڈلواتا تھا...... بنگال سے نامی گرامی جواری بلوا کر انہیں شہر کے چوراہوں پر
متعین کیا' جو راہ گیروں کی نہ صرف جیبیں خالی کرتے بلکہ ان کے جسم کے کپڑے تک
داؤ پر لگا دیتے۔ چوری اور جوئے کی آمدنی ہر شام باقاعدہ حساب کے ساتھ خزانے میں
جمع ہوتی تھی..... ایک مرتبہ اس نے ایک نئے قلعے کی تعمیر کا منصوبہ بنایا اور حکم صادر
کیا کہ شہر کے سب لوگ اپنے سروں پر اینٹیں ڈھوئیں گے اور اپنے ہاتھوں سے گارہ
کر کے قلعہ کی دیواریں تعمیر کریں گے' اگر کوئی معذور یا بوڑھا شخص اپنے ساتھ
کرائے پر مزدور لے کر بھی آتا ہے تو یہ بات مرزا یوسف کو ناگوار گزرتی۔ یوں ہر ایک
نے چاہے وہ کسی حال میں تھا' اپنے ہاتھوں سے بیگار کی۔ چغل خوروں کا ایک بڑا ٹولہ
اس نے اپنے ہمراہ رکھا ہوا تھا جن کو وہ حقیقت دان کہتا اور وہ ملک کے گوشے گوشے
میں خاص ہدایات کے ساتھ ہر کسی اور کھاتے پیتے عزت دار شخص کو ذلیل خوار کرتے
اور کرواتے رہتے۔ فصل پک جانے پر مرزا یوسف کے خاص آدمی اس کی دانہ بندی
اتنی بڑھا چڑھا کر کرتے کہ کسانوں کو لینے کے دینے پڑ جاتے اور پورا اناج دینے کے
باوجود بھی ان کے اپنے چوپائے نیلام کروانے پڑتے تب جا کے جان چھوٹتی۔ اگر ایسے
مظلوم اور مجبور آباد کار اس ظلم سے تنگ آ کر نقل مکانی کرتے تو مرزا یوسف کے
کارندے گھوڑے دوڑاتے ہوئے انہیں آ لیتے اور ان کا مال واسباب لوٹ کر لے
جاتے۔ مرزا یوسف ملک کے با اثر اچھے اچھے لوگوں کو ایک دوسرے کے خلاف بھڑکاتا
اور لڑواتا رہتا تھا تاکہ ایک طرف با اثر لوگ کمزور پڑ جائیں دوسری طرف ملک کی
وحدت قائم نہ رہے اور یوں وہ ملک پر اپنی گرفت مضبوط تر رکھ سکے۔ اگر کچھ لوگ
اس کے مظالم سے تنگ آ کر فریاد کے لئے دہلی یا ملتان کا رخ کرتے تو اڑوس پڑوس

کے نواب اور چھوٹے چھوٹے حاکم۔ مثلاً" بکھر' نصیرپور' ٹھٹھہ کے نواب اور حاکم ان کو راستے ہی سے مرزا کے پاس واپس بھجوا دیتے تاکہ وہ ان کی اچھی طرح خبر لے....."

سیون کے علاقے کے اس ظلمستان کے یہ واقعات خود وہاں کے ایک سرکاری واقع نویس' یوسف میرک' نے مخفی طور پر قلمبند کئے جو اس نے بعد میں "مظہر شاہجہانی" کے نام سے کتابی صورت میں ترتیب دے کر ۱۶۳۴ء میں مکمل کئے جس کا قلمی نسخہ اسی کے ہاتھ کا تحریر کردہ موجود ہے جو چھپ کر شائع بھی ہو چکا ہے۔ سندھ اور سندھ کے لوگوں کی اس بے کسی کی دکھ بھری داستان کو قلمبند کرتے کرتے آخر یوسف میرک کے دل سے بھی ایک آہ نکل گئی جو اس کی کتاب میں درج ہے۔ جسے انتصار کے ساتھ وطن کے غلامی پر ازلی تبرا ایک طرف تو دوسری جانب وطن دوست ریاست کے بنیادی سماجی کام کا ایک سچا اور جامع بیان شمار کیا جا سکتا ہے۔ وہ کہتا ہے۔

"کار ملک بجائی رسید کہ ملک ناپرسان و ملک بیدادان و ملک بیکسان شد چون آدم لاملک گرانند' ہزار گونہ فساد دین و دنیا پیدا میشود' چراکہ مدار عالم وابستہ معاش است۔"

ملک' دین اور دنیا' یعنی ریاست' مذہب تہذیب' اور عالم کا یعنی سماج کا دارومدار معاش (گذر اوقات اس کے وسائل اور پیداوار) پر یعنی جب لوگ ریاست سے محروم ہو جاتے ہیں اور وہ جا کر ایسے لوگوں کے ہاتھ لگتے ہیں جو ان کو نہیں پوچھتے اور نہ ہی ان کی داد رسی کرتے ہیں اور وہ لوگ اس ریاست میں بے کس بن جاتے ہیں۔ یعنی ان کی معاش اور اس کے وسائل ان سے چھن جاتے ہیں' تو نہ ان کا دین سلامت رہتا ہے' نہ دنیا' ان کا مذہب اور تہذیب دونوں فساد میں گھر جاتے ہیں اور ان کا سماج ایک حقیقی اور بنیادی نوع کے بحران کی لپیٹ میں آ جاتا ہے' ان پر اپنی زندگی کی آزمائش اور اپنے وجود کی بقاء کی آزمائش آجاتی ہے' اور ان کے سامنے اپنی نجات کی کامل جدوجہد کے سوا اور کوئی راستہ نہیں بچتا حتیٰ کہ بلاخر وہ سماجی طور پر متحد ہو کر از سر نو مضبوط ہو جائیں اور اپنی محب وطن قومی ریاست قائم کر سکیں اور اس کے سائے میں رہ کر

اپنی تہذیبی یعنی ذہنی اور معاشی خوشحالی حاصل کرنے کے لئے ضروری تخلیقی اور پیداواری کام کر سکیں۔ اپنی محب وطن قومی ریاست کے زیر سایہ خاص کر' اور ویسے بھی اپنے آپ عموماً" کوئی ملک' قوم یا سماج تہذیب کے میدان میں صرف معاشی طور پر کس قدر کوشش میں مصروف رہتا ہے' اور اس کی کوشش کے ثمرات غلامی میں کس طرح برباد ہو جاتے ہیں اس کی کئی مثالیں بھی ہمیں اپنی تاریخ میں ملتی ہیں۔

احمد بیگ کے دور نوابی میں سیون کے باغبان علاقے کی بربادی کا ذکر کرتے ہوئے "مظہر شاہجہانی" کے مصنف "یوسف میرک" لکھتے ہیں۔ خانوادہ سمہ کے دور اقتدار میں (یعنی تقریباً ایک سو سال قبل) یہ خطہ آبادی اور خوشحالی کے لحاظ سے درجہ کمال پر تھا۔ مخدوم جعفر بوبکائی نے مرزا عیسیٰ ترخان سے کا ذکر کیا تھا کہ جب پہلے پہل ۹۲۱ھ سے ذی العقد (۱۵۱۵ء دسمبر) میں (جام نندہ کے زمانے میں) شاہ ارغون قندھار سے جب یہاں حملہ آور ہوا تو کم سے کم ایک ہزار اونٹ جو رات میں وہاں پر رہٹ پر کام کر رہے تھے انہیں زبردستی لے گیا۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ علاقہ دوسری باتوں میں کتنا خوشحال اور سرسبز شاداب تھا۔ (اس کے علاوہ) سندھ کے والی جام نندہ کے دنوں میں اس نے اپنے ایک ہندو وزیر بنام چانگہ اور دریا خان کو سیون بھیجا۔ جنہوں نے وہاں آکر آب باراں پر بہنے والی ساوہ' نام کی ایک نہر تیار کرائی جس کا پانی منچھر جھیل میں آکر جمع ہوتا تھا اس جھیل کے شمال میں گاہا نامی رعایا کھیتی باڑی کرتی تھی' اور اس کے جنوب میں بوبک کے لوگوں گچ اور مانہ کی ملاوٹ سے ایک پکا بند یا پشتہ تعمیر کیا جس کے ذریعے وہ کاچھے کی زمینوں تک پانی لے گئے جس کے باعث وہاں پر کثرت کے ساتھ کھیتی باڑی ہونے لگی۔ ان کاچھے کی زمینوں پر اس نے اس طرح محصول رکھا کہ پیداوار کے ۹ حصے رعایا اور ایک حصہ سرکار کو ملتا تھا۔ تب بھی سرکار یعنی ارغونوں اور ترخانوں کے ستر سال اور دہلی کے مغل تسلط کے بیس سال کے عرصے بعد ۱۶۰۷ء میں جہانگیر کی تخت نشینی پر خود یوسف میرک کے والد میر قاسم نمکین کو ملی' میر قاسم نے

اپنے بیٹے یوسف میرک کو ایک مضبوط ترین مسلح جماعت ساتھ دے کر سیمون روانہ کیا اور خود ایک دو دن کے بعد پیچھے پیچھے قیام کرتا ہوا آ رہا تھا۔ اپنے سیمون صوبے کے اس پہلے سفر کی روداد بیان کرتے ہوئے یوسف میرک لکھتا ہے کہ " راستے بھر جہاں بھی میں نے نظر دوڑائی ویرانی ہی ویرانی نظر آئی۔ یوں لگتا تھا بیچ کے دور میں وحشیوں نے بسیرا کر رکھا تھا۔" اس نے مزید ۲۰ سال گذرنے کے بعد ۱۶۲۸ء میں احمد بیگ کی نوابی اور اس کے ظالم بھائی مرزا یوسف کی کارستانیوں کا ذکر کرتے ہوئے خود سپاہی لکھتاہے کہ "ملک کی حالت بربادی کے اس دہانے پر جا پہنچی تھی کہ چار پانچ ماہ سے خود سپاہیوں کو کوئی خرچہ نہیں مل رہا تھا۔ اس لئے کئی مرتبہ انہوں نے لوٹ مار مچانے کی غرض سے ہر قوم پر حملہ کیا مگر ناکام ہوئے۔ بالآخر وہ فصل جو قدرتی آفات کا نشانہ بن چکی تھی اس پر جا کر قبضہ کیا جیسے کوئی مفت چیز ہاتھ لگی ہو...... ادھر احمد بیگ کو خود ہاتھ پاؤں مارنے سے کچھ ہاتھ لگ جاتا تو وہ اس کے پاس پہنچنے سے پہلے کچھ اس کے لفنگے ملازم ہتھیا لیتے اور باقی پر باغی قبضہ کر لیتے" چھ سال بعد اپنی کتاب کا اختتام کرتے ہوئے یوسف میرک لکھتا ہے "احمد بیگ کے دور نوابی میں جو بستیاں ویران ہوئیں وہ اب تک ویران ہی رہیں۔" خانوادہ سمہ کی وطن دوست طرز حکومت کا والہانہ ذکر کرتے ہوئے یوسف میرک لکھتاہے کہ "واقعی اگر کوئی رعایا خوشحال ہو اور ان کے اوپر کوئی ظالم حاکم مسلط نہ ہو تو ایک ایک آدمی جو دس بیگھا بمشکل آباد کر سکتا ہے وہی پانچ سو سے لے کر ہزار بیگھا تک بلکہ اس سے بھی زیادہ زمین سر سبزو شاداب کر لے گا۔ پیداوار بڑھائے گا اور خوشی خوشی محصول دے گا۔ اگر رعایا خوشحال ہے تو یقین ہے کہ وہ اپنی بساط کے مطابق دریا میں سے ایک چھوٹا سا نالہ نکال کی اس سے دور دراز کی ریتلی بنجر زمیں آباد کر سکتے ہیں۔ جہاں پر کسی شخص، چرند پرند، تک سایہ نہیں پڑا ہو....... میں نے خود ایسا ہی ایک مشاہدہ چانڈ کا کے علاقے میں کیا ہے جہاں میر ابڑو نام ایک زمیندار نے چھوٹے دریا جیسا ایک نالہ نکال کر دور دور تک پھیلی ہوئی غیر آباد اور

برسوں سے پڑی بنجر زمین کو آباد کیا اور جہاں کسی چرند، پرند، انسان کی شکل تک نہ دیکھی تھی وہاں نئی بستیاں بنائیں، اس طرح اس نے "جوگی" اور "مٹھ" نامی شہر بنائے، اس طرح سندہ ابڑو نامی زمیندار "پوپٹی" نامی اور شاہ علی جو ابڑوں کا پیر تھااور خود کو مہدوی کہلاتا تھا اس نے بھی "کوتل" نامی شہر بنائے۔ اس طرح ابڑوں، سانگیوں اور سمیجوں میں سے ہر شخص نے جو اس خطے کا رہنے والا تھا اپنے طور پر بند باندھ کر، ندی نالے بنا کر غیر آباد زمین کو آباد کیا اور چھوٹے چھوٹے ٹیلے اور گاؤں آباد کئے حتیٰ کی "بکھر" ملک کی جمعبندی ایک دم ۱۲ لاکھ "تنکوں" سے بڑھ کر ۳۰ لاکھ سے ۴۰ لاکھ جا پہنچی اور یہ سب کچھ اس لئے ہوا کہ لوگوں کو کچھ عرصے تک ایک انسانی دل رکھنے والے نواب (محمد علی بیگ بندوی) کے زیر حکومت رہنے کاموقع میسر آیا۔"

تقریباً دو سو سال (۱۵۲۰ء---- ۱۷۳۶ء) سندھ اور اہل سندھ ارغونوں' ترخانوں اور دہلی کے مغل حکومت کے لالچی اور خون چوسنے والاوں کے زیر تسلط پستے رہے اور یوں ان کے یہ دشمن ان کی تہذیبی زندگی کا گلا گھونٹتے او جسمانی صلاحیتوں کو ختم کرتے رہے' ان کے ہر قومی اظہار پر دشمن کی غرور آور سنگینیں اٹھ جاتی تھیں...... مگر ان دو صدیوں کا تمام وقت وہ اپنے بچاؤ اور وطن کی نجات کے لیے مسلسل لڑتے رہے۔ ان دو سو سالوں کی پوری تاریخ شاہد ہے کہ اس سارے عرصے میں کوئی بھی مہینہ' ہفتہ یا دن ایسا نہیں گذرا جس میں وہ اپنے مقدس فرض سے ایک لمحے کو بھی غافل ہوئے ہوں۔ مگر قابل افسوس بدقسمتی ان کی یہ بھی رہی کہ وہ اس پورے عرصے میں اپنے داخلی' قومی اور مذہبی نفاق کا شکار رہے اور اس نفاق کو بڑہانے اور اس سے فائدہ حاصل کرنے میں ان کے دشمن نے بھی کوئی کسر اٹھا نہ رکھی' جنھوں نے اس مقصد کے لئے پہلی بات یہ کی کہ سندھ کو ٹکڑوں میں تقسیم کیا اور ان کی متحد قومی ریاست کا شیرازہ بکھیر دیا۔ ارغونوں نے "ولایت سندھ" کو چھ "سرکاروں" میں اور مغلوں نے چار" "ملکوں" میں تقسیم کیا اور پورا عرصہ یہ یا وہ "سرکار" اس سے یا دوسرے "ملک" "یا سرکار" آپس میں لڑتے رہتے اور دوسرے یہ کہ تمام "سرکار" اور "ملک" اپنے وجود کی برقراری کے لئے اور لوٹ مار کو جاری رکھنے کے لیئے اپنے دائرے میں' ہر قبیلے کے

اندرونی تنازعات بڑہاتے رہے اور ان کو ایک دوسرے سے ٹکرانے پر اکساتے رہے۔ لاکھا قبیلہ سمیوں کے خلاف' سمیوں کو سومروں کے خلاف' سومروں کو ماچھیوں کے خلاف' ماچھیوں کو مہروں کے خلاف' مہروں کو کہریوں کے خلاف' کہریوں کو کلہوڑوں کے خلاف' کلہوڑوں کو داؤ پوٹہ کے خلاف' داؤ پوٹہ کو پنوہروں کے خلاف' پنوہروں کو اس کے خلاف' بلوچیوں کو سماٹوں کے خلاف' سماٹوں کو بلوچوں کے خلاف' جان بوجھ کر ورغلاتے' لڑواتے' کمزور کرتے اور خون خرابا کرتے رہے۔ اس کے علاوہ مذہبی فرقہ وارانہ انتہا پسندی' مذاہب کے درمیان عدم مساوات اور عداوتیں ان کے لئے اپنے حکومتی کاروبار کو چلانے اور قابض اقتدار کو قائم رکھنے کا ایک تیسرا سوچا سمجھا اور آزمودہ طریقہ کار تھا جس کے ذریعے وہ محکوم قوم' اور عقائد و ایمان کی جال میں پھنسی ہوئی سادہ لوح رعایا کو آپس میں لڑاتے' خاموش کراتے اور اپنی ہمنوائی کے لئے بوقت ضرورت کام میں لاتے رہتے تھے۔

سندھ اور سندھی سماج کے پس دو سو سال غلامی کے آخری ۴۷ سال شاہ عبداللطیف بھٹائی نے خود اپنی آنکھوں سے دیکھے۔ وہ ۱۶۸۹ میں پیدا ہوئے اور ۱۷۳۷ء میں مغلوں کے آخری نواب صادق علی خان' جس نے ملک ٹھٹھہ دہلی کے مغل شہنشاہ محمد شاہ رنگیلے سے ٹھیکے پر لیا تھا' اور اس نے پہلے سال کی ٹھیکے کی رقم جیسے تیسے پوری کر دی' دوسرے سال اسے نقصان ہوا اور اس نے ملک کی باگ ڈوز کلہوڑوں کے سربراہ میاں نور محمد کے حوالے کر دی۔ ملک سیہون' ملک بھکر' ملک سیوی پہلے ہی اس کے ہاتھ میں آچکے تھے "اور اس وقت سے ہندوستان کے حکمرانوں کی حکمرانی کا سلسلہ ٹھٹھہ سے ختم ہو چلا اور عباسی خاندان "کلہوڑا" کو بکھر' سیوستان اور ٹھٹھہ کی فرمانروائی میں ہمیشہ کے لیے سرخ روئی نصیب ہوئی"۔ (تحفہ الکرام) اوریوں "سندھ کے ٹوٹے ہوئے ٹکڑوں کو جوڑنے کا مقصد تکمیل کو پہنچا۔ صدیوں بعد یہ پہلا مرحلہ آیا کہ متحدہ سندھ کے انتظام اور ضابطے کی مرکزیت کے مقاصد ان اصلی اہل وطن حاکموں

کے ذریعے پورے ہوئے" (تاریخ کلہوڑا مہر)

کلہوڑا سندھ کا قدیم اور اصل باشندوں میں سے ایک نمایاں قبیلہ تھا جو ہمیشہ سے ہی سندھ کے باہر سے آئے ہوئے حکمرانوں کے خلاف اپنے طور پر مزاحمت کرتا چلا آ رہا تھا۔ تاریخ میں ان کی اصل نسل سندھی (چنہ) سے بتائی جاتی ہے حالانکہ مسند اقتدار پر بیٹھتے ہی انہوں نے اپنی ذات عربوں سے جوڑنے کے لئے خود کو عباسی کہلانا شروع کر دیا۔ ورنہ تب تک اور جیسا کہ آج بھی سندھ میں ان کی ذات کی شاخیں کلہوڑا، داؤپوٹہ، آربانی، ببسانی، وغیرہ مشہور تھیں اپنے اپنے قبیلے کے نام کو چھوڑ کر خود کو عرب عباسی کہلانا غیروں کے سلسلے میں ان سے احساس کمتری سے زیادہ ان سے کاندھے جوڑنے اور خود اپنے لوگوں پر اپنی حاکمانہ برتری جتانے اور رعب بٹھانے کی کوشش کے مترادف تھا۔ بہرکیف ان کے پہلے بڑے جام چنہ (۱۳۲۰ء) کا تاریخ میں ذکر ایک معتبر قبیلے کے معزز شخص کی حیثیت سے کیا گیا ہے، اسے سیہون سے چھ کوس (۱۲) میل، دور جھانگارابا جاوا کے شہر بسائے، وہ سات قبیلوں کا ریجہ، ہتہ چنہ، سمہ، مہر بلال، اور ڈہر کا سردار تھا۔ تاریخ سندھ میں یہ پہلی مثال ملتی ہے جب مختلف اور ایک سے زائد قبیلے مل کر وسیع تر قومی اتحاد کی طرف قدم بڑھاتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ وہ ایک بہت بڑا خبر گیری کرنے والا اور سلجھا ہوا زمین دار اور صاحب حیثیت، سخی اور بہادر آدمی تھا۔ اس کا دستور تھا کہ وہ کسانوں کے پاس اناج کے بٹوارے کے لئے اپنے آدمی کبھی نہیں بھیجتا تھا۔ کسان اپنے طور پر پیداوار کا مقرر آٹھواں یا دسواں حصہ خود لا کر اسے دے جاتے تھے۔ جب وہ زمیندار کا حصہ لے کر آتے تو ان سے تین سوال کئے جاتے: تم پر کوئی قرض تو نہیں، تمہاری کوئی جوان بیٹی تو نہیں جس کی تمہیں شادی کرنی ہو، تمہارے گھر میں چھ مہینے کی خوراک کا اناج ہے؟ اگر جواب ملتا کہ قرض دار ہوں، گھر میں بن بیاہی بیٹی ہے یا چھ ماہ کا اناج گھر میں نہیں تو اس سے بٹائی کا حصہ نہیں لیا جاتا اور تاکید کی جاتی کہ جا کر اپنی ضروریات پوری کرو۔ سندھ کا معزز سردار

جام چنہ سندھ کے وطن دوست سومرو حکمرانوں کے دور سے تعلق رکھتا تھا۔ سندھ کے اصل باشندوں پر مشتمل حکمرانوں کی ریاست کے زیر سایہ سندھی تہذیب اور اس کی تعمیرو ترقی کے دور کے کئی اور واقعات اور سندھی سورماؤں کے داستان ملتے ہیں۔ جس میں ان کی بہادری، عدل و انصاف، غیرت، نیکی اور سخاوت کی مثالیں بیان کی گئی ہیں۔ جام چنہ کی دسویں پشت میں جب سندھ کی اصل حکمرانی کے سنہری دور کو ختم ہوئے بھی ایک سو سال گذر چکے تھے اور اس درمیان ظالم اور لٹیرے ارغون اور ترخان جیسے باہر سے آئے ہوئے حکمرانوں کا دور بھی آخری سانس لے رہا تھا اور ان کی جگہ دہلی کے اور زیادہ ظالم اور خون چوسنے والے مغل تسلط کی صدی شروع ہونے والی تھی، تب کلہوڑا قبیلے کا ایک دوسرا ایسا ہی نیک نام، بہادر، وطن پرست، قبیلوں کا سردار میاں آدم شاہ کلہوڑا سندھ کی تاریخ میں نمودار ہوا۔ ۱۵۹۱ء میں شہنشاہ اکبر کی طرف سے عبدالرحیم خان خاناں سندھ کو ترخانوں سے چھین کر مغل تسلط میں لانے کے لئے مقرر ہوا۔ اپنے کام کی کامیابی کے لئے سندھ کے جن بزرگوں کے پاس وہ گیا ان میں میاں آدم شاہ کلہوڑا بھی شامل تھا۔ میاں آدم شاہ نے ترخانوں اور مغلوں کے تصادم سے فائدہ اٹھاتے ہوئے بیرونی فاتحوں کے خلاف بغاوت کا علم بلند کیا اور ایک تاریخ نویس کے الفاظ ہیں۔ "کیونکہ وہ امن میں خلل ڈالنے پر بضد ہی تھے اس لئے ملتان میں شہید ہوا"۔ ایک اور مورخ کے لفظوں میں "میاں صاحب کے خلاف ملتان کے حاکم کے دل میں حسد پیدا ہوئی اور جس نے ان پر حملہ کروا دیا۔ میاں صاحب کے ساتھی ہار گئے اور وہ پکڑے گئے اور انہیں سزائے موت دی گئی"۔ سندھی کے ایک اور مورخ نے اس واقعے کو یوں بیان کیا ہے۔ "میاں آدم شاہ کے مریدوں کا حلقہ اتنا وسیع ہو گیا تھا کہ اس کی وجہ سے نزدیکی زمیندار اور پڑوسی قبیلے کے سرداروں کے دل میں حسد پیدا ہوئی۔ جنہوں نے بعد میں میاں صاحب کے خلاف بکھر کے (مغل) ناظم کو خوفناک باتیں بتائیں۔ ناظم نے میاں صاحب کو ملتان بھیج دیا۔ جہاں انہوں نے جام

شہادت نوش کیا۔" سترہویں صدی کے ایک فارسی شاعر نے اس موقع کو یوں بیان کیا ہے۔

"بترسید والی زپیرو مرید' بایمای حاکم ہلاکت وسید"

جس میں "ولی" سے مراد بکھر کے ناظم سے ہے جو "پیر اور اس کے مریدوں سے خوفزادہ ہو گیا تھا" اور "حاکم" سے مراد ملتان کا حاکم ہے جس نے ان کو شہید کروایا۔ میاں صاحب اس طرح دشمنان وطن سے لڑتے ہوئے' وطن پر قربان ہو گئے۔

میاں صاحب شہید کی اس قربانی سے تقریباً ایک سو سال بعد ۱۶۸۹ء میں حضرت شاہ عبدالطیف بھٹائی نے جنم لیا۔ اس درمیانی عرصہ میں میاں صاحب کے پوتا' میں شاھل محمد' مغل حکمرانوں سے وطن کی آزادی کی جنگ لڑتے ہوئے مارا گیا۔ اس کے بعد اس کا بھتیجا' میاں نصیر محمد (وفات ۱۶۹۲ء) کو اسی وطن دوستی کے جرم میں عمر کے کئی برس لاہور' ملتان' میں جلا وطنی کے عالم میں گزارنے پڑے' اور گوالیار اور دہلی میں اورنگزیب کی قید میں بھی رہنا پڑا۔ میاں نصیر محمد کے بیٹے میاں دین محمد نے دشمن کے خلاف اپنی جنگ جاری رکھی' اور اورنگزیب کے بیٹے معزالدین اور ان کے نوابوں اور سپہ سالاروں کو کئی مقامات پہ شکست سے ہم کنار ہونا پڑا لیکن آخر کار وہ دشمن کے دام فریب میں آگیا اور قرآن پاک کی ضمانت پر اپنے دو قریبی عزیزوں سمیت مذاکرات کے لئے معزالدین کے پاس گیا جس نے وعدہ شکنی کی اور انہیں گرفتار کر لیا اور ملتان لے جا کر اسے اور اس کے دونوں ساتھیوں کو بے رحمی سے اذیتیں دیں اور جسم ٹکڑے ٹکڑے الگ کر کے ہلاک کروا دیا۔ میاں دین محمد اور ان کے ساتھیوں کی شہادت کا یہ واقعہ ۱۷۰۰ء عیسوی میں پیش آیا۔ اس وقت شاہ عبد الطیف گیارہ سال کے تھے۔ میاں دین محمد کے بعد اس کے چھوٹے بھائی میاں یار محمد بمعہ اہل و عیال اور دوسرے ساتھیوں سمیت پہاڑی علاقوں میں پناہ گزین ہو گیا اور وہاں سے مغل شہزادے معزالدین کی فوج سے جنگ جاری رکھی اور اسے شکست دی۔ بعد میں پہاڑوں سے

نیچے اتر آئے اور نیسنگ (ضلع دادو) سے ہوتا ہوا منچھر جھیل کے کنارے والے شہروں' ساستانی اور گاہن کے اراضی' فتح پور (؟) شکار پور (خدا آباد) گمبرو' کھاری' کنڈیارو' لاڑکانہ آزاد کرا کے اپنے قبضے میں لے لیے۔ بہت جلد جب مغلوں نے اپنی حکومت کے سورج کو روبہ زوال دیکھا تو پہلے پہل سیوی اور ڈاڈھر کا انتظام بطور رشوت اور بعد میں بحالت مجبوری پورے بکھر اور پورے سیہون کے علاقے کا اختیار میاں یار محمد کے حوالے کیا اور اسے خدا یار خان کے لقب کے ساتھ خلعت' سونے کی کلنگی' تلوار' گھوڑا' اور ہاتھی بھی حوصلہ افزائی کی خاطر دیے۔ سرزمین سندھ کے ایک حصے شمالی سندھ کے اقتدار کی یہ منتقلی ۱۷۰۸ء سے ۱۷۱۱ء تک عمل میں آئی۔

اپنے وطن عزیز کی ناموس اور نجات کی بحالی کی جدوجہد کے یہ ڈرامائی واقعات شاہ عبداللطیف نے اپنی انکھوں سے دیکھے اور کانوں سے سنے' جب یہ واقعات رونما ہوئے وہ بھرپور جوان تھے' اس وقت ان کی عمر ۱۹ سے ۲۲ سال تھی۔ ملتان کے مغل حاکم' اورنگ زیب کے بیٹے معزالدین' کے فریب کی وجہ سے گرفتار ہو کر سندھ پر قربان ہو نے والے میاں دین محمد اور اس کے دو ساتھیوں کی شہادت کے دنوں میں شاہ صاحب ۱۱ برس کے تھے۔ اس کے بعد باقی گیارہ برس سندھ اور سندھ کے لوگوں کی نجات اور تحفظ کی اس تحریک کا مشاہدہ جس کے عمل کا دائرہ شمال سندھ میں تھا اور جس محترک اور توانائی کا مرکز اور روح کلہوڑا قبیلے کے بزرگ تھے' براہ راست اور قریب سے قریب رہ کر کرتے رہے۔ اس قدر جذبے سے سرشار اور جاندار قومی جدو جہد کے دوران پورے سندھ میں کلہوڑا خاندان کے وطن دوست بزرگوں کے کارناموں کی داستان سب سے پہلے ان کے نیک مرد' جام چنہ سے لے کر مظلوم شہید میاں آدم شاہ' میاں شاھل محمد' میاں نصیر محمد' کا طویل ترین قید وبند' میاں دین محمد اور اس کے ساتھیوں کی شہادت اور میاں یار محمد کی کامیاب جنگی کاروائیوں تک ہر عورت' مرد' بچوں جوانوں اور بوڑھوں' میں یکساں عام ہوئی ہو گی۔ اس کے ساتھ ساتھ اپنے قومی

راج سرداروں اور حاکموں' سومروں اور سموں کے عظیم وطنی ریاست کے دنوں کے قصے اور داستانیں بھی ہر ایک زبان پر عام ہوئیں ہوں گی۔ درمیان میں ارغونوں' ترخانوں اور دہلی کے مغل حکمرانوں اور ان کے وحشی اور سفاک نوابوں کی خونخواری کی دو سو سال دور حکومت کی دل ہلا دینے والی کارستانیوں کی داستانیں بھی لوگوں میں عام ہوئیں ہو گئیں۔ سندھ کی تاریخ کا یہ ایک بحرانی دور تھا اور پورا سندھی سماج اس منزل پر ایسے بحران کی انتہائی تیزی اور شدت کی کیفیت سے دو چار تھا۔ جب سندھی سماج کی قسمت کا سوال اٹھا تھا اور اس کے حل کی راہ ہموار ہونے شروع ہوئی تھی' اور ان کے ذہنوں میں اپنے وجود کا خیال کے اپنی اہمیت کے شعور کا احساس ایسے بیدار ہو رہا تھا جیسے موسم گرما میں کالے کالے بادل شمال سے گھر گھر کر آتے ہیں اور دیکھتے دیکھتے پورے آکاش پر چھا جاتے ہیں۔ شاہ کے اشعار ہمارے پاس اس ابھرتے ہوئے قومی شعور کے احساس اور اس کے اظہار اور اس سماجی وجود کی اہمیت اور قسمت کے بنیادی سوال کے حل کے نشان ہیں۔ شاہ کے حساس ذہن میں سندھ اور سندھی سماج کی غلامی کے جنہم کے خلاف کسی پر بہار اور روح پرور مسرت کی بہشت کا خواب جلوہ گر ہوا تھا۔ سندھ کی ریاست سندھ کے مذہب اور سندھ کی تہذیب کو اپنا کہنا اور اس میں اپنائیت کو دیکھنے کا خواب شاہ کی پوری شاعری اس خواب کا عکس اور بیان ہے' کیونکہ یہی بات' یہی امنگ اور یہی مقصود شاہد شاہ کے دور میں سندھ اور سندھی سماج کی اصلی' حقیقی اور اہم بات تھی۔

۱۷۰۷ء مغلوں کے شہنشاہ اورنگزیب کا انتقال ہوا۔ اور اس کی موت کی ساتھ اس کی عالمگیریت بھی ہوا ہو گئی۔ اس وقت شاہ عبداللطیف کی عمر ۱۸ سال تھی۔ مغلوں کی "سندھ ولایت سوان" کے تین ملک' سیوی' ملک' بکھر' ملک سوان پہلے ہی یا ان کے کچھ سالوں بعد ۱۷۱۱ء تک مغل تسلط سے عملی طور پر آزاد ہو چکے تھے باقی صرف ٹھٹھہ رہ گیا تھا جو اس فالج زدہ مغل تسلط کے زیر انتظام تھا۔ سندھ کی نجات اور بحالی کی

تحریک کا دوسرا دائرہ جنوبی سندھ (لاڑ) میں تھا جس کا روحانی مرکز اور روح رواں بجھورہ علاقے کی جھوک (نصریہ' میران پور) کے لانگاہ قبیلے کے بزرگ تھے۔ اس درویش خاندان کے پہلے بزرگ کا ذکر جو میاں آدم شاہ کلہوڑ کے ہم عصر تھے' سندھ کی تاریک مخدوم صدر لانگاہ کے نام سے ملتا ہے۔ جس کے لئے کہا جاتا ہے کہ وہ ایسا تارک الدنیا تھا کہ رات کو پانی کے بھرے ہوئے مٹکے بہا دیتا تھا۔ اور کہتا "نیا دن نیا رزق" اس کے عقیدت مندوں کو وسیع حلقے میں مختلف قبیلوں کے ساتھ ساتھ جنوبی سندھ کے نیاری و سادات شامل تھے۔ مخدوم صدر لانگاہ کی پانچویں پشت سے سندھ کے شاہ شہید عنایت نے بالکل ایسے ہی حالات میں اور اسی طریقے سے ٹھٹھہ کے مغل نواب کے ہاتھوں جام شہادت نوش کیا' جن حالات میں اور جس طرح کلہوڑوں کے سرفروش بزرگ' میاں آدم شاہ ملتان کے مغل نواب کے ہاتھوں تقریباً ایک صدی پہلے شہید ہوئے تھے۔ ان حالات میں فرق تھا! کہ میاں صاحب شہید کی پانچویں پشت میاں یار محمد کلہوڑ جس نے مغلوں سے "بکھر" "سیون" اور "سیوی" آزاد کرائے وہی میاں یار محمد اپنے اس مظلوم پردادا شہید کی شہادت کو بھلا کی خود اپنے عظیم مقصد یعنی سندھ کے عظیم تر اتحاد اور قومی ریاست کے قیام کو بھلا کی خود سندھ کے معصوم شہید شاہ عنایت کی شہادت میں ان خونخوار اور خونی مغل دشمنوں کا حامی ہو گیا۔ یہ کیونکر ہوا؟ اس کا سیدھا سا جواب ہے : قومی اتحاد کے اصولوں کی ناکامی۔ قومی اتحاد کے کیا اصول ہیں اور ان کی ناکامی کیا ہے ان کا ذکر آگے چل کر کریں گے۔ مگر سندھ کی تاریخ کے اس اہم بحرانی دور میں جب سندھی قوم کی قسمت کا سوال اٹھایا گیا تھا اور اس کے حل کے لئے زمین ہموار ہو رہی تھی۔ اس کی نجات اور بحالی کے لئے لڑنے والا) کے نفاق کے نت میں سے ایک فریق پہلے ہی دائرے میں کامیابی حاصل کر چکا تھا) کے نفاق کے نتیجے میں سندھ اور سندھ کے لوگوں نے کیا برداشت کیا اور ان کی تاریخ تاریکیوں کی کیسی درد ناک کھائیں تک جا پہنچی' اس کا صحیح اندازہ تک لگانا مشکل ہے۔ اورنگزیب کے انتقال

کے بعد (۱۷۰۷) اس کے بیٹوں اور پوتوں کے درمیان فساد اور لڑائیوں (چھ سال میں چار شہزادے تخت نشین ہو کر دستبردار ہو گئے) مغل اقتدار کا زوال (جس کے لئے کہاوت مشہور ہوئی کہ "شاہ عالم ازدلی تا پالم" یعنی شاہ عالم' ۱۷۱۲ء کا حکم فقط دہلی سے پالم تک مغل نظام کی پستی (جس کا ذکر مشہور مزاح گو شاعر جعفر زٹلی نے اس طرح کیا ہے کہ "سکہ زد برگندم موٹھ مٹر بادشاہ پسہ کش فرخ سیر" یعنی فرخ سیر' مچھر مارنے والا بادشاہ گندم موٹھ اور مٹر پر محصول لگا رہا ہے)' خود ٹھٹھہ میں علک نوابوں کی ایک کے بعد ایک کی مقرری اور معزولی -۱۷۰۷ء سے ۱۷۱۷) تک آٹھ نواب آئے اور گئے) اور ان کی محلاتی سازشیں اور خانہ جنگیاں' سارے ملک میں قحط اور بدامنی' اور اس کے ساتھ سارے سندھ (سیوی' بکھر' اور سیہون کے علاقے) کا مغل تسلط سے پہلے ہی نکل جانا' ایسے حالات میں باقی سندھ کو مغلوں کے شکنجے سے چھڑانا' کتنا ہی آسان معاملہ ہو سکتا تھا! مگر ایسا ہو نہ سکا۔ سندھ میں مغل تسلط کی گرتی ہوئی عمارت گرتے گرتے سندھ کی آزادی کے لئے کوشاں دو مرکزوں کو آپس میں ٹکرا کر ہی رہی اور اپنا آپ بچا کر پورے کے پورے ۲۰ سال اس کے بعد بھی وہ ویسے کی ویسی سندھ کے لوگوں کے سینوں پر مسلط رہی۔

جھوک (شاہ عنایت کی شہادت) کے قومی سانحے کے وقت (۱۷۱۸ء) شاہ کی عمر ۲۸ برس تھی۔ جب ۲۰ برس بعد ۱۷۳۷ء میں مغلوں نے ولایت سندھ کے باقی حصے ٹھٹھہ کو بھی کلہوڑوں کے میاں نور محمد کے حوالے کیا اور سندھ سے اپنا بوریا بستر باندھا' تب وہ اپنے زوال کے ایسے کھڈ میں گر چکے تھے کہ "شامت اعمال ماصورت نادر گرفت" روح قبض کرنے والا عذاب ان پر نازل ہو چکا تھا۔ کلہوڑے اگر ۲۰ سال پہلے یہ سیاسی غلطی نہ کرتے اور ٹھٹھہ کی نوابی کے لئے مغلوں پر نہیں بلکہ شمالی سندھ کی طرح ملک ٹھٹھہ جنوبی سندھ) کی نجات کے لئے اپنے جیسے ہی درویش مجاہد صوفی شاہ عنایت شہید اور ان کے فقیروں پر بھروسہ کرتے' تو سندھ کے اتحاد اور آزادی سے

متعلق یہ خواب ۲۰ سال پہلے ہی عمل میں آ چلا ہوتا' اور ان ۲۰ برسوں میں انہیں اپنے وطن کو خوشحال اور مضبوط کرنے کا نادر موقع مل جاتا اور ایسے میں نہ تو شکست خوردہ محمد شاہ رنگیلے کو سندھ کے نادر شاہ کے حوالے کرنے کا سبب ملتا' اور نہ خود نادرشاہ کو پلٹ کر سندھ پر حملہ کرنے کا آسان بہانا ملتا' نہ ہی ہمت اور حوصلہ ہوتا۔ کلہوڑوں کی اسی سیاسی غلطی کی وجہ سے جس کے سبب ایک طرف سندھ کے لوگوں میں تفرقہ برقرار رہا اور دوسری طرف ان کو اپنی متحد قومی ریاست کو مضبوط کرنے کی فرصت نہ مل سکی' جب دو برس بعد ۱۷۴۰ء میں نادر شاہ دہلی کی آسان ترین فتح کے گھمنڈ میں وہاں کی بے انداز دولت اور مال غنیمت کے ساتھ سندھ کو بھی اس کا حصہ سمجھ کر سندھ پر حملہ آور ہوا' تب کلہوڑوں کی حکومت سندھ کا دفاع نہ کر سکی اور سندھ ایک بار پھر سے ٹکڑے ٹکڑے ہو گیا۔ ورنہ تاریخ شاہد ہے کہ یہی نادر شاہ تھا اور یہی اس کی فوج تھی جب ایک سال پہلے ۱۷۳۹ء میں وہ "قندھار کی فتح کے بعد درہ بولان کے راستے ہندوستان پر حملے کا سوچ رہا تھا مگر اس راستے سیوی اور گنجابہ کے حاکم میاں نور محمد کو مقابلے کے لئے تیار کھڑا دیکھ کر اس نے درہ بولان کا راستہ تبدیل کر کے غزنی' کابل اور درہ خیبر کا راستہ اختیار کیا۔" حقیقت میں سندھ پر نادر کے اس تباہ کن حملے اور اس میں کامیابی کے لئے بھی سندھی سماج کا اپنا داخلی نفاق جوابدار تھا۔ ۱۷۳۹ء کے اواخر میں سندھ پر حملہ کرنے کے لئے جب نادر اپنی فوجوں کو لے کر ڈیرہ اسماعیل خان تک پہنچا تو داؤد پوٹہ (کلہوڑا خاندان ہی کے ایک شاخ) کی رئیس امیر صادق محمد خان خود اس کے پاس گئے اور میاں نور محمد کلہوڑو کے خلاف نادر کو ہر قسم کی مدد کی پیش کش کی اور سارا راستہ اس کے ساتھ رہا۔ "تاریخ سندھ۔ کلہوڑا دور" کا مصنف مولانا" مہر" ۱۷۳۷ء میں مغلوں کے ہاتھوں ٹھٹھہ کا میاں نور محمد کے حوالے ہونا اور یوں اس کے ماتحت سندھ کا متحد ہونا اور ان کی ایک مرکزی متحدہ ریاست کے قیام کا ذکر کرتے ہوئے لکھتا ہے کہ "صدیوں کے بعد یہ موقع میسر آیا تھا کہ متحدہ سندھ کی

ریاست کا انتظام اس کے اصل باشندوں کے ہاتھوں میں تھا اور وہ اہل سندھ کی ضرورتوں سے پوری طرح آگاہ تھی اور خلوص قلب کے ساتھ اس کو پورا کرنا وہ اپنا اولین فرض سمجھتے تھے۔ یہی نادر موقع تھا کہ سندھی اپنے قومی حکمرانوں کی خدمتوں سے پوری طرح مالا مال ہوتے اور صدیوں سے وہ جن مصیبتوں اور صعوبتوں کا شکار تھے ان سے نجات پالیتے۔ کہ اچانک ایک وحشت ناک آفت سندھ کی افق پر نمودار ہوئی جس نے اس سرزمین کی نئی زندگی کی امید کو ایک بار پھر خاک میں ملا دیا اور یہ اچانک آفت پر نادر شاہ ایرانی کی صورت میں نازل ہوئی...... میاں یار محمد اور میاں نور محمد نے قریب قریب چالیس برس کی جانفشانی کے بعد جا کے سندھ کے الگ الگ ٹکڑوں کو ملا کر ایک کیا اور عوام کی فلاحی مملکت کا انتظام کیا تھا۔ لیکن نادر کے حملے نے ان چالیس برسوں کی محنت پر ایک دم سے پانی پھیر دیا۔ دونوں میاں صاحبان نے اس سرزمین کے وسائل بہتر بنائے۔ ان کا اصل مقصد خزانہ جمع کرنا نہیں بلکہ یہ تھا کہ عوام کے لئے امن اور خوشحالی کے زیادہ سے زیادہ وسائل پیدا کیے جائیں' لیکن چالیس برسوں میں جو کچھ اکٹھا ہوا تھا وہ نادر ایک ہی مرتبہ لوٹ کر لے گیا...... بہرحال اس سے بڑھ کر سندھ کے نقصان کا باعث جو بات تھی وہ یہ کہ سندھ کی وحدت پھر سے پارہ پارہ ہو گئی۔" ایک اس حصہ (کچھی ڈھاڈھر اور کراچی) قلات کے حصے میں آگیا' شکار پور اور اس کے آس پاس کا علاقہ داؤپوٹوں نے لیا اور ملک کا باقی حصہ (ٹھٹھہ کا علاقہ وغیرہ) میاں نور محمد کے پاس رہا۔ میاں صاحب کا بڑا بیٹا محمد مراد یاب دو ہزار سواروں اور دو بھائیوں غلام شاہ اور عطر خان سمیت نادر کے پاس ۱۷۴۷ء میں اس کے قتل ہونے تک ایران میں یرغمال رہے۔ اس کے علاوہ "سندھ کا کتب خانہ اور جرائد بھی وہ سفاک' ناپاک اپنے ساتھ لے گیا" مطلب یہ کہ سندھ اور اہل سندھ اپنی تاریخ کی عین اس منزل پر جبکہ ان کے سامنے قومی یکجہتی کا سوال ہی ایک اہم اور واحد سوال تھا' وہ اقتدار کے سلسلے میں ایک دوسرے پر شک کا شکار ہو گئے اور اندرونی نفاق اور

رنجش کے باعث ایک دوسرے کے لئے بجائے طاقت کے کمزوری کا سبب بن گئے۔ اور یوں صدیوں بعد قومی اتحاد کی بحالی کا ملا ہوا موقع ہاتھوں سے گنوا بیٹھے اور اتنی جدوجہد اور قربانیوں کے بدلے جیتی ہوئی آزادی کی بازی ایک مرتبہ پھر ہار کر بیٹھ گئے۔

نادر کے حملے کے وقت شاہ صاحب کی عمر ۵۰ برس تھی اور سچل گیارہ برس کے تھے' سامی ۱۰ برس کے تھے۔ نادر کے قتل ہونے کے بعد سندھ کے تین شہزادوں میں سے' غلام شاہ اور عطر خان جب ۱۷۴۹ء میں ایران سے آزاد ہو کر اپنے وطن (سندھ) لوٹے تو سچل اور سامی ۲۰ اور ۱۹ سالوں کے کڑیل جوان تھے۔ دو سال بعد سندھ کا ولی عہد شہزادہ محمد مراد یاب بھی واپس اپنے وطن پہنچا۔ حضرت شاہ عبداللطیف بھٹائی کو اس کے بعد اس خاکی جسم میں فقط ایک سال رہنا تھا۔ ان کی عمر کے پورے ۶۳ سال ہی سندھ کی آزادی اور اتحاد کی جدوجہد کے سال تھے۔ گیارہ برس کی صغیر عمر میں انہوں نے اپنے شہزادوں کے پردادا میاں دین محمد' اور ان کے دو ساتھیوں کو وطن کی آزدی کے لئے لڑنے کے جرم میں سندھ سے باہر ملتان میں کٹ کر ٹکڑے ہوتے سنا۔ ۲۲ سال کی عمر میں انہوں نے اسی میاں دین محمد شہید کے بیٹے میاں یار محمد کی زیر کمان شمالی سندھ کی سیوستان اور بکھر کو غیروں کے قبضے سے آزاد کرواتے دیکھا۔ ۲۸ برس کی عمر میں انہوں نے آزادی کے بعد مجاہد صوفی شاہ عنایت اور ان کے فقیروں کو جنوبی سندھ کی آزادی کے لئے پروانوں کی طرح لڑتے لڑتے قربان ہوتے دیکھا۔ اڑتالیس برس کی عمر میں انہوں نے سندھ کی آزاد وطنی ریاست کے دو سو سالہ پرانے خواب کی عملی تعبیر ہوتے دیکھی جب پورا سندھ اپنے جنوبی (لاڑ) اور شمالی علاقوں سمیت میاں یار محمد کلہوڑو کے زیر حکمرانی آیا' اور تاریخ میں ایک مرتبہ پھر دوبارہ اس کی ایک متحد اور آزاد ریاست وجود میں آئی' اور دو سال بعد اس نے خواب کو ٹوٹتے ہوئے بھی دیکھا۔ "جب نادر شاہ شکار پور' لاڑکانہ اور نوشہرو سے ہوتا ہوا شہداد پور تک آن پہنچا تو اسے کچھ ایسے لوگ آ کر ملے جو میاں صاحب کے مخالف تھے۔ انہوں نے اسے

عمرکوٹ کے راستے کا پتہ دیا (جہاں میاں نور محمد فوجی حکمت عملی سے کام لے کر محفوظ بیٹھ گئے تھے۔) اتنے میں ماچھی قبیلے کی فوج کا ایک دستہ نادری لشکر کے سامنے راستہ روک کر کھڑا ہو گیا اور بڑی بہادری سے لڑا۔ ابھی یہ جنگ جاری تھی کہ صحرا تھر کی طرف سے ایک اور فوج نمودار ہوئی جو میری قبیلے والوں کی تھی جس پر فقط نو سو سوار تھے۔ انہوں نے اتنی پھرتی اور تیزی سے حملہ کیا کہ ایرانیوں کے پیر اکھڑتے اکھڑتے رہ گئے۔ (سندھ کے لشکر کے) یہ جانباز دستے نادری سیلاب کو بہرحال روک نہ سکے"۔

شاہ صاحب اپنے بھٹ کے آستانے پر شہداد پور سے چودہ میل دور بیٹھے قومی عظمت و ذلت کے سارے رنگ دیکھتے رہے اور باتیں سنتے رہے۔ جیسے ہی نادری غنیم واپس ہوا ویسے ہی والی سندھ میاں نور محمد نے اپنی طاقت بڑھائی اور مضبوط کرنا شروع کی۔ اس کے لئے انہوں نے ۱۷۴۸ء میں بمبئی کے انگریزوں سے انتیس (۲۹) توپیں اور دوسرے سال دس بڑی توپیں بھی درآمد کرلیں۔ مگر شاہ صاحب یا میاں نور محمد' دونوں میں سے کوئی بھی دوبارہ سندھ کا اتحاد و آزادی نہ دیکھ سکا۔ شاہ صاحب ۱۷۵۲ء میں انتقال کر گئے اور ان کے تین سال بعد میاں نور محمد اپنے نور چشموں اور امیدوں کے مرکزوں کو عمل و اخلاق کا وصیت نامہ دے کر اس دنیا سے کوچ کر گئے۔ سندھ کی ان دو اعلیٰ ہستیوں کے انتقال کے بعد ۱۷۶۰ء میں دونوں کی دعاؤں اور امیدوں کے مرکز' میاں غلام شاہ کلہوڑو' کے ہاتھوں سندھ کے اتحاد و آزادی اور سندھ کی وطنی ریاست کے قیام کا مقصد ایک مرتبہ پھرپورا ہو سکا۔ اس کے بعد سندھ کی کلہوڑا ریاست ایک بار پھر سے جانشینی کے تفرقے میں ایسی غلطاں ہوئی کہ ۱۸۰۳ء تک کلہوڑہ حکمران ایک دوسرے کے خون سے اپنے ہاتھ رنگتے رہے۔ ایک کے بعد دوسرا آتا اور جاتا رہا۔ حتیٰ کہ اس کی جگہ تالپور آ گئے' اور وہ بھی سندھی ریاست کو صرف چالیس برس برقرار رکھ سکے اور اسی طرح کے اپنے داخلی نفاق اور اقتدار کی کشمکش کی تباہ کاریوں کا شکار ہو گئے۔ اور یوں سندھ اور سندھی سماج ایک مرتبہ پھر سات سمندر پار سے آئی ہوئی غیر قوم کا

غلام ہو گیا۔ شاہ صاحب کا روحانی وارث سچل سرمست اس تاریخ سے کوئی سولہ سال پیشتر انتقال کر چکا تھا اور سامی کا اس کے بھی بعد ۱۸۵۰ء میں انتقال ہوا۔

شاہ' سچل اور سامی کے دور کے یہ برس (۱۶۸۹ سے ۱۸۵۰ء) سندھ اور سندھی سماج کی تاریخ کے انتہائی اہم اور بنیادی طور پر بحرانی برس تھے۔ ان دنوں سندھی سماج اپنے اجتماعی وجود کی بحالی اور بقاء کی جدوجہد میں مصروف تھا۔ مگر افسوس کہ اس جدوجہد کی کامیابی کی لازمی شرط یعنی قومی اتحاد' سندھی سماج کو نصیب نہ ہو سکا۔ اس کا اصل سبب سندھی سماج میں اقتدار کے لئے داخلی کشمکش اور گروہی تصادم تو تھا ہی مگر اس کا اتنا ہی بڑا سبب مذہب بھی تھا۔ سندھی سماج کے ان دو داخلی امراض نے اس کو جیسے پہلے ویسے اس دور میں بھی ریاست نہ بننے دیا اور نہ قوم۔

اکثریت کے مذہب کی کثیر تعبیروں نے نہ صرف یہ کہ اس اکثریت کی اعتقادی یکسوئی کو تباہ کیا بلکہ اس میں وطن دشمنی اور قومی غداری کی حد تک فرقے پیدا کئے۔ اقلیت سے مذہبی رویے کا حال یہ تھا کہ "لا اکیرہ فی الدین" اور لکم دینکم والدین جیسے عظیم مصالحتی اصولوں کے ہوتے ہوئے بھی صرف "رسو" کہنے والے کو "رسی" میں باندھ دینے کے لئے افراد تیار بیٹھے تھے۔ حکمران اکثریتی مذہب والوں کے پاس لفظ "بنیا" تب بھی حقارت اور خواری کے طور پر ہندوؤں کے لیے استعمال ہوتا تھا۔ شاہ کی زندگی کے دور کا یہ واقع (جیسے بیاض ہاشمی میں آیا ہے) کہ ۱۱۵۷ھ (بمطابق ۱۷۴۴ء) میں ایک ہندو بال چند نامی نے مسلمانوں سے باتیں کرتے ہوئے جواب میں کہہ دیا کہ "میں بنیا نہیں ہوں۔" پھر تو اس کے لئے قیامت برپا ہوئی کہ "اس نے ہندو ہونے سے انکار کیا ہے لہٰذا یہ مسلمان ہو گیا!" اس بیچارے نے بہت زیادہ آہ بکاہ کی مگر سب بے سود' اس کے اوپر گواہ مقرر ہوئے اور مسئلہ قاضیوں اور مفتیوں کے سامنے پیش ہوا۔ ٹھٹھہ کے مخدوم ضیاء الدین' مخدوم حاجی محمد ہاشم' شیخ عطاءاللہ مفتی' شیخ عنایت اللہ مفتی' اور شیخ محمد عارف مفتی' نصرپور عزت اللہ مفتی اور مخدوم

عبدالخالق، نوشہرو کے مخدوم ابوالمعالی، گھارو کے مخدوم عبدالرحیم، کوٹڑی کے مخدوم عاقل، اور کھاہی راہو کے مولوی محمد کامل نے ایک رائے ہو کر فتویٰ دیا کہ بال چند مانے یا نہ مانے لیکن وہ یہ الفاظ کہنے کے بعد مسلمان ہو گیا اور اس پر اسلام کے ارکان واجب ہیں، انکار کی صورت میں اسے مرتد شمار کیا جائے گا جس کی سزا قتل ہے" ایک ایسا ہی واقعہ شاہ صاحب کے دور کا بھی ہے جو اسی بیاض میں ہے) کہ ۱۱۵۹ھ (بمطابق ۱۷۴۶ء) میں دو آدمیوں نے ٹھٹھہ کے عالموں اور قاضیوں کے سامنے ایک ہندو عورت کی بابت یہ شہادت دی کہ اس نے احمد نامی ایک شخص سے زبانی لڑائی کرتے ہوئی اسے بے ایمان کہا، جس پر احمد نے اس سے پوچھا، کہ تو ایمان رکھتی ہے؟" جواب میں عورت نے سندھی میں کہا "ہاں میں ایمان رکھتی ہوں"۔ اب سوال یہ اٹھا کہ وہ ہندو عورت یہ جملہ کہنے کے بعد مسلمان ہو چکی ہے یا نہیں؟ عالموں نے جواب دیا کہ وہ ہندو عورت یہ جملہ کہنے کے بعد مسلمان ہو چکی ہے، حاکموں پر لازم ہے کہ وہ شواہدات کی نشاندہی کے پیش نظر اس عورت پر اسلام کے احکام جاری کریں۔ مذہبی رسہ کشی اور دھتکار کے لئے یہ دو مثالیں کوئی ایسی خاص اہمیت کی حامل نہیں جبکہ "بیاض ہاشمی" یا کئی اور بیاضیں ایسے کئی مثالوں سے پر ہیں۔ اور یہ صورتحال صرف سندھ کی یا اس دور کی نہیں تھی بلکہ اس سے بھی ڈھائی سو سال پہلے سندھ کے سمہ حاکم جام نظام الدین عرف جام نندہ کے (دور حکومت (۱۴۶۰ء سے ۱۵۰۷ء) کے ہم عصر شمالی ہند کے حاکم سکندر لودھی کے دور کے متعلق "طبقات اکبری" میں آیا ہے کہ "ایک برہمن بودہن نامی کاتیر شہر کا رہنے والا تھا۔ ایک مرتبہ اس نے مسلمانوں کے آگے اقرار کیا کہ اسلام سچا اور میرا مذہب بھی صحیح ہے، (اسلام حق است و دین من نیز درست است) ان کی یہ گفتگو کسی طرح عالموں کے کانوں تک پہنچی جن میں لکھنوتی کے رہنے والے دو مولوی قاضی پیارے اور شیخ بڈھے نے خواہ مخواہ اس بات کو طول دی اور وہ سیدھے وہاں کے نواب اعظم ہمیوں کے پاس گئے جس نے اس برہمن کو ان

مولویوں کے ساتھ (سلطان سکندر لودھی) کی طرف (صدر مقام) سنبل روانہ کیا چونکہ سلطان کو علمی مذاکرات سے بڑی دلچسپی تھی اس لئے اس نے نامی گرامی علماء کو ہر طرف سے بلا بھیجا جن میں میاں قادن بن شیخ خو، میاں عبداللہ بن اللہ، سید محمد سعید خان دہلی والے اور سید میراں بن سید احسن قنوج والے قابل ذکر ہیں، اس کے علاوہ عبدالرحمٰن سیکری والا، میاں سید صدر الدین قنوجی اور سنبل کے میاں عزیز اللہ اور دیگر علماء ہمیشہ سلطان کے ساتھ ہوتے تھے جو اس معرکے میں شامل ہوئے۔ تحقیق کے بعد علماء کرام کا اس بات پر اتفاق ہوا کہ برہمن کو باندھ کر (حبس کردہ) اسلام کی طرف لانے کے لئے دعوت دی جائے اور اگر انکار کرے تو قتل کر دیا جائے قصہ مختصر برہمن، بودہن اسلام نہ قبول کرنے کی پاداش میں قتل ہوا۔ سلطان نے بعد میں مذکورہ علماء کو انعام و اکرام سے لاد کر اپنے، اپنے شہروں کی طرف روانہ کیا........" سندھ میں کلہوڑوں کے بعد میروں کے دور اقتدار کے متعلق کچل اور سامی کے دور کے ایک انگریز مصنف ڈاکٹر برنس کے تاثرات خود اس قسم کی صورت حال کی نشاندہی کرتے ہیں ۔ میروں کا ذکر کرتے ہوئے وہ انگریز ڈاکٹر لکھتا ہے وہ فطرتاً" نیک، بامروت، اور خوش اخلاق تھے پر مشرکین کے بارے میں سختی سے کام لیتے تھے۔ جنوب (لاڑ) علاقے میں کسی بدنصیب ہندو سے کوئی غلطی اگر سرزد ہو جاتی تو اسے پکڑ کلمہ پڑھوا کر ختنہ کروا دیتے۔ میروں کی زبردستی ان کی تبلیغی سرگرمیوں سے ظاہر ہوتی ہے۔

عقل اس بات پر حیران ہے کہ آخر اس ملک میں ہندو کیوں پڑے ہوئے ہیں! اس کا فقط ایک ہی سبب ہو سکتا ہے یعنی جنم بھومی سے ان کی محبت...... کہیں بھی دو مومن اگر کہیں شہادت دیں کہ کسی ہندو نے قرآن کی آیتیں یا کلمہ پڑھا ہے تو دو شہادتیں اسے ایک دم سنت بٹھانے کے لئے کافی ہیں"۔ تاریخ سندھ کی یہ ایک ثابت اور تصدیق شدہ حقیقت ہے کہ ایسی ہی ایک مذہبی کدورت والی روش نے سندھ میں سیٹھ ناؤں مل جیسا ایک غدار پیدا کر دیا۔ اس سیٹھ ناؤں مل سے تین صدیاں پہلے بھی

سندھ کو ایسا ہی قاضی قاضن بھی نصیب ہوا جو ایک بیرونی حملہ آور سندھ کے قاتل دشمن شاہ بیگ اور ارغون سفاک سے ہمنوائی اور مدد کرنے پر آمادہ ہوا۔ یہی مذہبی عقائد کا اختلاف تھا جس پر بھروسہ کرتے ہوئے اکبر کے خون خوار سپہ سالار' عبدالرحیم کو سندھ کے کچھ سجادوں اور خانقاہ نشینوں سے سندھ کو غلام در غلام بنا کر رکھنے اور سندھ کی عوام الناس کو لوٹنے کھسوٹنے ' اور کچلنے وغیرہ کے لئے دعائیں مانگنے کی ضرورت محسوس ہوئی اور ان حملہ آوروں کو ان کاموں کے لئے وہ دعائیں اور دعاؤں کے ساتھ امداد بھی ملیں!

شاہ' سچل اور سامی اپنے سماج کے حساس اور باخبر شاعر تھے۔ ان کو اپنے سماج کے دکھوں اور امنگوں کا علم تھا۔ انہوں نے اس کی امنگوں کی ترجمانی کی اور اس کے دکھوں کا علاج کیا۔ سندھی سماج کو ایک آزاد اور باعزت سماج بن کر رہنا تھا اس میں سے نفاق اور دوغلے پن کو ختم ہونا تھا۔ اس کو ٹکراؤ (دوئی) کی بجائے وحدت کی ضرورت تھے۔ اس میں اپنا اجتماعی وجود کا شعور ہونا تھا۔ اس میں فرد یا گروہ کے مفادات کو جماعت کے مفاد پر قربان ہونا سیکھنا تھا' یعنی اس کے سارے انفرادی اغراض کو ختم کر کے ایک اجتماعی اور جامع غرض کی صورت لینا تھا تاکہ زیادہ سے زیادہ مفاد اور خود پسندیاں اس میں سما جائیں اور راضی ہو جائیں' اور یوں بالاخر اپنا وجود اس میں گم کر دیں۔ اس کے بہتر شہریوں کے دل میں فرض کا احساس پیدا ہونا تھا جسے وطن دوست یا قوم کے لئے قربانی کا جذبہ کہتے ہیں' اور جو ہر باشعور قوم میں ایک نسلی خوبی کی طرح موجود ہوتے ہیں۔ وہ رواجی طور پر تو دوسروں سے علیحدگی کا جذبہ ہوتا ہے جو اپنے نہیں ہوتے' پر تربیت پائے ہوئے ذہنوں میں وہ کسی جامع مقصد سے وفاداری یا وابستگی کی صورت میں نمودار ہوتا ہے۔ سندھی سماج کو تاریخ میں اپنے لیے اعلیٰ مقصد کی حاصلات کا فرض قبول کرنا تھا' انسانی تہذیب کے خاص نمونے کے طور پر' اپنے مخصوص تہذیب و تمدن کر حفاظت و ترقی کا مقصد آج اس کے پرعزم دفاع اور اجتماری حمایت کے بغیر ہو سکتا

ہے اور یوں مکمل کے حقیر درجے تک جا کر پہنچ سکتا ہے۔ اس کو اپنی بقاء کا حق ثابت کرنے کے لئے اپنی طاقت اور صلاحیت قائم رکھنی تھی' اس لئے کہ صرف صلح جوئی سے قومیں کسی بھی مقصد کی صرف پیش قدمی نہیں کر سکتیں بلکہ اکثر صرف طاقتوروں اور بدمعاشوں کا لقمہ بن سکتی ہیں اور بن جاتی ہیں۔ اس کو اندرونی امن اور اتحاد کے لئے قانون اور انصاف کی بالادستی قائم رکھنی تھی اور مخالف خیالات و نظریات کے متصادم ہونے سے روکنے کے لئے برداشت اور رواداری کی فضا قائم کرنا اور ہمیشہ موجود رکھنا تھا۔ سندھی سماج میں نئے انسان کی تعمیر ہونی تھی' ایک ایسے بلند پایہ انسان کی تعمیر کہ جس کا آدرش اونچا ہو' جس کے خیالات بلند اور اعمال بھی ایسے ہی اونچے اور اعلیٰ ہوں' محبت' مروت' رواداری' صبر' حوصلے' ہمت اور ایثار اور انتھک محنت کا مالک ہو' جو امن پسند' خیر اندیش ہو" جو محب وطن ہو' فرض شناس ہو' اور اپنے آزاد' کشادہ دل' اور باعزت سماج میں آزاد' پرخلوص اور باعزت زندگی بسر کرنے کے لائق ہو۔ شاہ' سچل اور سامی نے اپنے وطن عزیز میں ایسا ایک سماج بنانا چاہا تھا اور اس میں ایسے ایک اعلیٰ انسان کی تربیت کرنا چاہی تھی۔

سندھ کے یہ عظیم شعرا' مذہبی لوگ تھے' خاص کر اس لحاظ سے کہ انہوں نے اپنے پیغام میں مذہبی اصطلاح کو بھی استعمال کیا۔ لیکن انہوں نے یہ پیغام سندھی زبان میں اہل سندھ کو دیا ہے جن کو اس کی ضرورت تھی۔ شاہ اور سچل کو بہت کچھ اسلام کے بارے میں سمجھانا تھا اور سامی کو بہت کچھ ہندو دھرم کے متعلق' اور ان تینوں شعراء کو خالص مذہب کے (ان دیکھے میں) ایمان والے اصل اور الاصول کو بھی سمجھنا اور سمجھانا تھا۔ مقصد ان کی اس کوشش کا یہ تھا کہ سندھ کے لوگ محسوس کریں کہ مذاہب خواہ مخواہ ان میں کوئی دوری نہیں پیدا کرتے' خاص کر جب ان کو عقل کی آنکھ سے دیکھا جائے' یعنی تہذیب سے جس قدر ان کا واسطہ یا اشتراک تھا اتنی حد تک وہ ان کو جوڑ کر رکھ سکتے تھے اور جوڑے ہوئے تھے۔ ان کا یہ رابطہ ان کے سماج کے لئے

ایک بڑی نعمت تھا بلکہ وہ ان کے وجود کے بقاء کی ضمانت ہو سکتا تھا۔ مگر ریاست یعنی سرکاری اقتدار کے معاملے میں یعنی اس کی شراکت کی وجہ سے ان میں سے ایک کی فوقیت اور زیادتی ان میں نفاق کا موجب بن رہی تھی' جس نفاق کی وجہ سے ان کو یعنی ان کے سماجی وجود کو کبھی کوئی فائدہ نہیں مل سکتا تھا بلکہ بالآخر اس کے نتیجے میں اسے مسمار ہو کر زمین بوس ہونا تھا' اور اس صورت میں ان کا باقی وجود انسانی دنیا میں بیکار بے معنی اور وقار سے خالی ہو جاتا تھا۔ تاریخ نے اہل سندھ کو شاہ کی زندگی ہی میں ثابت کر دکھایا تھا کہ کس طرح جھوک کے صوفی مجاہدوں اور حکمران کلہوڑا فقیروں کے مابین مذہبی اختلاف اور نفاق نے سندھ کی آزادی اور قومی بحالی کو بیس برس پیچھے دھکیل دیا' اور اس بیس برس کی محرومی نے انسان کی بنی بنائی قسمت کو جس طرح سے بدبختی میں بدل دیا اور اس کا کوئی اندازہ ہی نہیں لگا سکتا۔ سچل اور سامی کی زندگی ہی میں سندھ کے لوگوں نے دیکھا کہ مذہبی کٹرپن نے کس طرح ان میں "تاؤں مل" کو پیدا کر کے ان کی سو سالہ غلامی کے لئے سرزمین ہموار کی' جس کی ابتدا سامی نے اپنی آنکھوں سے دیکھ لی۔ اپنی جدید تاریخ میں اہل سندھ نے دیکھ لیا کہ دونوں فریقوں کو بدلے میں سوائے ہولناک خوف اور بے بسی کے اور کچھ نہ نصیب ہوا۔ اہل سندھ کے سامنے ان کی بھلائی کی وہ راہ ہو جو ان کے عظیم شعراء نے ان کو دکھائی' رواداری' محبت اور اتحاد کی راہ' وہ آج بھی ان کے سامنے موجود ہے اور آج بھی اس پر چل کر وہ اپنا طاقتور' خوددار اور باعزت سماج قائم کر سکتے ہیں اور وسیع انسانی برادری میں اپنی مخصوص تہذیب کی حفاظت اور بہتری کے اعلیٰ فرائض کی بجاآوری کر سکتے ہیں۔

فن اور شعر کے مطالعے میں عام طور پر' اور ہمارے ہاں خاص طور پر شاہ سچل اور سامی کے مطالعے میں' ان کے فن اور اشعار پر مذہب کا عنصر زیادہ تلاش کیا گیا ہے اور بتایا گیا ہے۔ مذہب کا فن اور شعر پر اثر انداز ہونا اپنی جگہ مگر فن اور شعر کا مذہب پر اثر بھی کافی گہرا ہوتا ہے' بلکہ پوری کی پوری تہذیب یعنی کسی خاص سماج کے مادی

اور ذہنی (روحانی) تخلیق کا اثر مذہب اور ریاست دونوں پر ہونا لازمی ہے' اور ان پر کن حالات میں تھوڑا یا بہت اور کن حالات میں پوری طرح اپنی قومی تہذیب کا رنگ غالب ہوتا ہے۔ قومی تہذیب اور قومی ریاست کی طرح مذاہب بھی قومی ہوتے ہیں' چاہے وہ کسی "عالمی مذہب" کے "ملحدانہ" یا بدعتی تفسیر ہی کیوں نہ ہوں۔ یہی وجہ ہے کہ راسخ "پختہ" عقیدے والوں نے مذہب کو تہذیبی یعنی "افادہ عام" والے (متحرک' ذی روح) ہر تفسیر کو کفر اور الحاد کہا ہے۔ سندھ دشمن شاہ بیگ ارغون نے سندھ کے فدائی' شہید اعظم' مخدوم بلال کو کافر کہلوا کر کولہو میں پسوایا۔ شاہ عنایت شہید پر برہنہ تلوار بردار جلاد کھڑا کر کے نواب اعظم خان نے پوچھا کہ "اولو الامر' کے حکم سے تم نے منہ کیوں موڑا؟" شاہ عنایت شہید نے جواب دیا "ہم مرید کعبے کی طرف کس طرح منہ کر کے کھڑے ہو سکتے ہیں' جبکہ ہمارے ہادی کا منہ مے خانے کی طرف ہو!" سندھ کے اس امر شہید کا سر تن سے جدا کرانے کے بعد نواب اعظم خان نے شہر میں منادی کر دیا کہ کوئی بھی آدمی "یا اللہ" کا نعرہ نہ لگائے' حکم عدولی پر تلوار سے اس کا سر تن سے جدا کر دیا جائے گا' اس لئے کہ "یا اللہ) شاہ شہید اور اس کے وطن دوست مجاہدوں کا نعرہ تھا۔ شاہ شہید کے وقت شہادت پر شاہ بھٹائی اپنی بھرپور جوانی میں تھے' اس وقت ان کے دل سے جو آہ نکلی ہمیں معلوم ہے "جھجاں پسیو جھوک آیل سنگھارن جی!" اور ماں اپنے سانس سے پیاروں کی جھوک (بیٹھک) سیکھ کر میرا دل خون میں گھلتا ہے اور انسو بہاتی ہے۔ شاہ سائیں کے یک ور رہم عصر اور محب وطن درویش "حضرت خواجہ محمد زمان لنواری والا" تھا جس کی ملاقات کی یاد میں ان کا ایک بیت مشہور ہے۔

مون سے ڈٹھا ماء' جنیں ڈٹھو پریں ء کھے
تنیں سندی کاء' کرئے نہ سگھاں گالھڑی

(او ماں' میں نے وہ دیکھے جنھوں نے پیار کا منہ دیکھا مجھ سے تو ان کی صرف بات

بھی ہو نہیں پاتی۔)

حضرت خواجہ صاحب کے بارے میں ایک بات مشہور ہے کہ "ایک مرتبہ ان کے ہاں ایک ہندو آیا اور منت کی کہ قبلا اس بندے کو اسم اعظم کی ہدایت کریں! حضرت نے ان کو ہدایت کی' جب وہ جانے کے لئے اجازت لینے لگا تو حضرت نے اس سے فرمایا ظاہری طور پر تم بے شک ہندو دھرم کی کریا کرم کرتے رہو مگر باطنی طور پر جو ہم نے تمہیں امانت عطا کی ہے' وہ حفاظت سے رکھنا' یہ لفظ سن کر حافظ پونھو نامی ایک ھیش نے اعتراض کیا کہ قبلہ یہ بھلا کس قسم کی مسلمانی ہوئی؟ حضرت خواجہ نے اس کی طرف آنکھیں اٹھا کہ فرمایا میاں' مسلمانی کر تجھے کیا خبر؟" حضرت خواجہ سے یہ بھی قول منسوب ہے کہ "دین قائم ہے حق کے لوگوں سے نہ کہ لاٹھی اور لڑائی سے" ظاہر ہے کہ سندھ کے محب وطن سمہ سلطان جام نظام الدین اور سندھ کے دشمن شقی القلب اور اہل سندھ کے قاتل سفاک شاہ بیگ ارغون کا دین و مذہب ایک نہیں ہو سکتا' اور نہ ہی مخدوم بلال اور قاضی قامن کا یا نواب اعظم خان اور شاہ شہید صوفی کا مذہب ایک جیسا ہو سکتا ہے۔ جن ملاؤں اور مفتیوں نے "ایمان والی" ہندو عورت اور بیٹے بال چند کو زبردستی مسلمان کیا' ان کا اور سلطان الاولیا خواجہ محمد زمان لنواری والے کا مذہب بھی تو ایک جیسا نہیں ہو سکتا جن سے اپنے ایک ہندو معتقد کو اسم اعظم کی امانت دے کر کہا کہ چاہو تو تم ظاہری طور پر ہندو کریا کرم پر قائم رہ سکتے ہو۔" ۔"تحفتہ الکرام" میں ٹھٹھہ کے ایک "اہل حال" بزرگ شاہ اسماعیل صوفی کا ذکر ہے کہ وہ شاہ شہید صوفی کے مخلصین میں سے تھے اور شاہ عبدالطیف بھٹائی کا ان سے یارانہ تھا اور وہ مثنوی کا درس بڑے انہماک اور محوتی سے دیتے تھے...... ایک مرتبہ درس دیتے ان کی طبیعت پریشان ہو گئی اور پورے بدن پر نیل پڑنے لگے جن کو چھپانے کے لئے رلی منگوا کر اوڑھ کر بیٹھ گئے۔ آخر ماجرہ یہ معلوم ہوا کہ "اس وقت قاضی شہر ٹھٹھہ کے کوتوالی میں چبوترے پر ایک شخص کو سرکاری ملازموں کے ہاتھوں بغیر کسی جرم کے صرف سیاسی

ضد کی بنا پر کوڑے لگوائے جا رہے تھے' اور وہ کوڑے اس بزرگ کی پیٹھ پر نمودار ہو رہے تھے" سچ تو یہ کہ "اہل حال" بزرگ شاہ اسماعیل صوفی کا مذہب کچھ اور تھا جس کے ساتھ سرکاری اہل کار ہم صلاح اور سمت تھے یا جن کے ساتھ وہ سمت اور ہم صلاح تھا' کہ جو کھڑے ہو کر ایک بے گناہ کا خوامخوہ کوڑے لگوا رہا تھا۔ شاہ بیگ ارغون' قاضی کا قامن نواب اعظم خان' ٹھٹھہ کا قاضی اور دوسرے فتویٰ باز ملاؤں اور مولویوں کا مذہب وہ ہی تھا جو غاصب' ہڑپ کرنے والے اور قابض گروہی مفاد اور ان کے ریاست اقتدار کو ہتھیار کے طور پر کار آمد ثابت ہو رہا تھا۔ اور جام نظام الدین' مخدوم بلال' شاہ شہید' خواجہ محمد زمان' شاہ اسماعیل صوفیؒ اور دوسرے "اہل حال بزرگوں" کا مذہب وہ تھا جو "افادہ عام" کے رنگ میں رنگا ہوا تھا' جس میں وقت کی حالتوں کا اثر دیکھنے میں آ رہا تھا' جو سندھی لوگوں کے تہذیب سے ہم آہنگ ہو رہا تھا' اور ان کے قومی مذہب کا روپ دھار رہا تھا۔ شاہ شہید صوفی جس کے لئے کہا گیا ہے کہ خود بھی بڑا شاعر تھا اور راگ کا متوالا تھا' شاہ اسماعیل صوفی جو مثنوی روم بڑی محویت سے پڑھتا تھا' خواجہ زمان جو خود بھی شاعر تھا' اور جمیل و شفیق ساتھ کے دوسرے بزرگ مثلاً" ٹھٹھہ کے مخدوم محمد معین' سہون کے مخدوم میاں دین محمد' اٹھم کوٹ کے مخدوم میاں پیر محمد' کوٹڑی کبیر کے مخدوم میاں محمد' روہڑی کے میر جان اللہ شاہ رضوی' گھوٹکی کے میاں موسیٰ شاہ جیلانی' اور کئی اس کے دوسرے اہل دل اور اہل حال بزرگ' صوفی باصفا اور عالم باعمل پورے سندھ میں سائیں کے نہ صرف ہم عصر دوست بلکہ ساتھی بھی تھے' جن سب نے سندھ اور سندھی سماج کی قومی بحالی اور قومی بقاء کے لئے سندھی عوام کا قومی اتحاد قائم کرنا چاہا' یہ اتحاد وہ سندھی عوام کی قومی تہذیب کی بنیاد پر قائم کر ناچاہ رہے تھے' اور دعویٰ اور دستور والے مذہب کی کوئی بات جو اس اتحاد کی راہ میں رکاوٹ کا موجب بن رہی تھی اسے انہوں نے ہٹانا چاہا تھا' بلکہ ریاست اور مذہب دونوں کے لئے وہ چاہتے تھے کہ تہذیب کے ضابطے اور تادیب تحت رہیں اور اس کی

ترقی و تعمیر کے کام آئیں - وہ سندھی لوگوں کی اجتماعی قوت کو قومی ریاست کا اور ان کے کثیرالا عتقادی کو قومی مذہب کا روپ دینا چاہتے تھے' تاکہ ان کے قومی اتحاد کے سامنے کوئی خطرہ باقی نہ رہے اور وہ اپنی مادی اور روحانی فلاح اور ترقی کی راہ میں مکمل بھروسے اور بے خوفی سے آگے بڑھنے اور بنی نوع انسان کی آفاقی مسرت اور کمال میں اپنی بساط کے مطابق اپنے حصے کا فرض ادا کر سکیں۔ حضرت شاہ عبداللطیف بھٹائی اپنے دور کے سندھ اور سندھی سماج کی اس پوری امنگ کا عظیم ترجمان یعنی ان کا عظیم شاعر' عظیم فنکار اور عظیم مفکر تھے۔ سچل اور سامی بھی سندھ اور سندھی سماج کی اس اجتماعی امنگ کے عظیم ترجمان اور شاعر تھے۔

سندھ کے محب' ایچ' ٹی سورلے نے' اپنی بہت اچھی کتاب Latif of Bhit Shah Abdul کے تاریخ والے حصے کے شروع میں انگریزی کے دو چھوٹے شعر لکھے ہیں۔

ایک آئزک واٹس (Issak Watts) کا

"وقت' ایک سدا بہتے ہوئے دریا کی مانند ہے
اپنی ساری پود کو اپنے ساتھ بہا کر لئے جاتا ہے
ایک خواب کی مانند وہ اڑتے اور فراموش ہوئے جاتے ہیں
جو صبح ہوتے ہی گم ہو جاتا ہے۔"

دوسرا ٹینیسن (Tennyson) کا

"دن اپنی پوری امنگ ترنگ کے ساتھ اڑتے اڑتے گم ہوتے جا رہے ہیں' مگر شاید ایک کوئی باقی رکھنے والی ادراک ہے' جو کبھی کبھی نکال کر لا دیتی ہے (اسے بھی خبر نہیں کہ کہاں سے)

ایک چھوٹا سا مد بھرا پیالہ' ایک پر کیف غیبی چسکی!"

وقت مستقل گزرتا جا رہا ہے' دن برابر گزرتے جا رہے ہیں ' مگر ماضی کے

چھوڑے ہوئے ڈھیروں میں بھی تلاش کرنے پر کچھ ایسے ہیرے کبھی کبھی مل جاتے ہیں' جن کے کردار کی سب سے اہم شہادت یہی ہے۔ اس طرح شاعری جو کسی قوم کے روحانی حافظے (اس کی زبان جس کا کلمہ ہے) میں موجود ہے' وہ ہی اس کی تہذیبی ارتقائی کتاب ہے' اس کی اصلی تاریخ ہے' جس کا اس قوم کے بننے اور کامیابی سے زندہ رہنے اور زندہ رہتے ہوئے آگے بڑھنے اور بلند ہونے میں بڑا ہاتھ رہتا ہے۔ شاہ' سچل اور سامی کی اعلیٰ شاعری' اپنے سچ' نیکی اور کمال حسن سے سندھی زبان میں محفوظ ہے' اور سندھی زبان ان کی فکر اور فن کی قوت سے آج سندھیوں کے اجتماعی وجود اور اس کے اتحاد و بقاء کا نشان اور اس کا بنیاد اور ضمانت ہے۔ ان کا یہ احسان کہ انہوں نے سندھ اور سندھی سماج کی اس اپنی زبان کو اپنی روح کی آزاد امنگ کے اظہار کا وسیلہ بنایا ہے' اور یوں اس کو اتنی توانائی' کشش اور وسعت دی کہ وہ سندھیوں کی قوم بننے میں اپنا تہذیبی کردار ادا کر سکی۔

شاہ' سچل اور سامی سندھی قوم کے استاد' اور رہبر ہیں خاص کر شاہ صاحب نے سندھی قوم کو اپنا رسالہ عطاء کر کے ان کو "اہل کتاب" ہونے کا شرف بخشا ہے۔ یہ اپنی چیز کو عظمت یا تقدس دینے کی بات نہیں بلکہ ایک حقیقت ہے۔ "شاہ جو رسالو" دنیائے جملہ مذاہب کا نچوڑ اور سنگم ہے اور سندھی تہذیب کی ساری حاصلات کا روح ہے۔ اس میں زنداوستا' گیتا' بدھ دھرم' جین مت' مسیحیت اور اسلام کی تعلیم کے اہم اور اعلیٰ اصول اور قدریں سب موجود ہیں جو یوں بھی بنیادی طور پر ساری ایک سی ہیں۔ اس کے کتنے ہی سر علیحدہ علیحدہ اور سارے کے سارے یا حصوں میں ان مذاہب کے اپنے' اپنے تربیتی ماحول اور تعلیمی اصطلاح پر مبنی نظر آتے ہیں۔ سندھی تہذیب نے زمانوں کے سفر کی یاد انمول سرمائے کے طور پر اپنے پاس اپنی لوک کویتا' لوک کتھا اور لوک کہاوتوں کی صورت میں محفوظ کر رکھا ہے۔ انہی مثالوں' باتوں اور واقعات کے مطالعے سے اخذ کئے ہوئے عام نتائج اور عام اصول شاہ صاحب نے اپنے رسالے میں

سندھی لوگوں کو سکھائے ہیں عالم آگہی کے عمل کلیہ ہی ہوش مندانہ اور دلپذیر طریقہ ہے۔ مکمل آگہی اور مطلق علم کبھی ممکن نہیں' اس لئے علم کے حاصلات کا تہذیبی یعنی تجرباتی اور آزمائشی طریقہ مذہبی طریقہ یعنی اعتقادی یا ایمانی طریقہ سے زیادہ قابل اعتبار اور زیادہ باثمر سمجھا گیا ہے اور ثابت شدہ ہے۔ تعلیم کے تہذیبی طریقے میں شک اور علم کی حاصلات کے لئے اولین اقدام شمار ہوتے ہیں۔ شک یا تنقید میں سے سچ' نیکی اور حسن کو کوئی نقصان نہیں پہنچتا' اس لئے سچ او نیکی کا ویسے بھی وقت پر ہی دارومدار ہوتا ہے' خود ضمیر پر بھی وقت کا اثر ہوتا ہے۔ مگر وجوہات تہذیبی ارتقاء کے لئے ضروری ہے اور ہر طرح سے عظیم ہے وہ سچ' نیکی اور حسن سے چاہت کا جذبہ خاص طور پر تب جب اس کے لئے خطرے کا سامنا کیا جائے۔ شاہ سائیں نے اپنے رسالے میں سندھیوں کو انہی کی اصطلاح میں ان کی اپنی مثالوں' باتوں اور واقعات کے ذریعے اسی سچ نیکی اور حسن سے محبت کے جذبے کی تربیت دی ہے۔

نکو سندھو سور جو نکو سندھو سک
عدد ناہ عشق پچھانی پان لے سندھو سک

(مصائب کی انتہا نہیں تو ذوق طلبی بھی انتہا نہیں' عشق کے آگے عدد نہیں ہوتا اپنی منزل وہ آپ ہے۔)

سچ نیکی اور حسن' حق ' خیر اور جمال' انسانی روح کے لئے تین بنیادی امنگیں ہیں اور ان کی بنیاد اصل میں انسان کے اپنے ذاتی مفاد پر رکھی گئی ہے۔ جو کچھ میرے اپنے فائدے کے لئے ہے' وہ میرے لئے حق بھی ہے' خیر بھی ہے اور اس میں مجھے حسن بھی نظر آتا ہے کیونکہ وہ مجھے اچھا لگتا ہے! مگر انسان یعنی فرد دنیا میں اکیلا نہیں اور ایک ذاتی مفاد دوسرے ذاتی مفادات کے تعلق اور نسبت سے عملی صورت لیتا ہے' اس لئے اگر محض زور (انفرادی یا گروہی) پر فیصلہ چھوڑنا نہیں تو بھی کئی ۔انفرادی یا گروہی مفادات کو "مل جل کر گذارنے" کے لئے "لین دین اور چھوڑنا چھڑوانا" کے طریقے

سے' "جیو اور جینے دو" کے اصول پر عمل لازمی بن جاتا ہے۔ اسی طرح "میری' ان کی" انفرادی یا گروہی نوع کی) بہت سچائیوں کے بیچ باہمی برداشت اور رواداری کے اصول کے سوا اور کوئی راہ نہیں۔ اور ان کی اپنی بقاء اور فروغ کے لئے بھی یہی واحد معقول اور مفید راستہ ہو سکتا ہے' برداشت' اور جیو اور جینے دو کے اصولوں پر عمل کرنے سے باہمی تعاون اور باہمی محبت بڑھتی ہے اور انسانوں میں ہر سطح کے گروہی اتحاد' امن' اور محبت بڑھتی ہے اور انسانوں میں ہر سطح کے گروہی اتحاد' امن ' اور ترقی کی راہ بنتی ہے۔ اور انہیں نفاق' جنگ کی ہولناکیوں سے تحفظ اور پناہ ملتی ہے' اور یوں تہذیب کے مذہب اور ریاست پر فوقیت کی صورت قائم ہوتی ہے' اور سماج سے غالب مذہب کے تعصب اور ہٹ دھرمی سے ایک طرف اور کسی غالب ریاست کے ظلم و تشدد سے دوسری طرف اور دونوں کی متحدہ موت جیسے عذاب سے (پوری طور پہ نہیں تو بھی) بہت حد تک نجات حاصل کرتا ہے اور یوں ادھر اس دھرتی پر وہ کامل انسان مسرت اور انسانی خیر کی جنت کی تعمیر میں اپنے حصے کا فرض ادا کر سکے گا۔ اور یہی ہر انسانی سماج کی ہر فرد کا دھرتی پر اعلیٰ مقصد ہو سکتا ہے۔

سندھ کے لوگوں اور سندھی سماج کو شاہ' سچل اور سامی نے اس دھرتی پر اس اعلیٰ مقصد سے روشناس اور اس کے لئے اسے تیار کرنا چاہا تھا۔ وہ سندھ کے استاد' ہادی و رہبر تھے۔ اور انتہائی بڑے انسان اور انتہائی بڑے شاعر تھے۔ انہوں نے سندھی سماج کو ایک نئی اجتماعی وحدت کے شعور سے واقف کیا' اور اس کے لئے اسے عملی راہ دکھلائی ' قومی تہذیب' قومی مذہب اور قومی سیاست کی راہ' مشترکہ مفاد اور باہمی تعاون کی راہ' محبت رواداری اور اتحاد کی راہ' عمل اور قربانی کی راہ۔ ان کے سامنے سندھ اور سندھی سماج کے آزاد باوقار' بامقصد اور خوشحال وجود کا خواب تھا۔ ان کے ہاں اس خواب کی تکمیل کا راستہ بھی تھا' دوغلے پن اور دوری کو ہٹانے کا' اپنوں کو اپنانے کا' یکجا ہونے کا' سچ نیکی اور حسن سے خود وابستگی اور ان پر خود کو نچھاور کرنے کا' سچی انسانیت کا' آدمی

کی عزت اور مان اور انسان کی سیوا اور پیار کا' انسانی تہذیب کے عروج میں اپنے حصے کا فرض ادا کرنے کا' عالمی امن' اتحاد اور ترقی کی جدوجہد میں حصہ دار ہونے کا۔ اب یہ ہم پر منحصر ہے کہ کس حد تک ہم اپنے اس فرض کو پہچانتے ہیں اور اس پر عمل پیرا ہوتے ہیں اور کس حد تک اپنے آپ کو عظیم استادوں اور راہبروں کے لائق ثابت کر سکتے ہیں۔

ساری بات کا دارومدار اس پر ہے کہ ہمیں اپنے آپ پر کتنا فخر ہے' کتنا اعتماد ہے' ہم ایک دوسرے سے کتنے سچے ہیں اور اپنی روح کو زندہ رکھنے کے لئے کتنا کچھ برداشت اور قربان کرنے کے لئے تیار ہیں۔ خدا کرے ہمارے جینے کی منطق ہم سے کبھی نہ بھولے' اور اپنی صلاحیت اپنی غیرت اور اپنے مان سے جینے کی امنگ ہمارے روح میں موجود رہے۔

پسی جھاجھ جمال جی جھمین پتی پک
اپر آگا منجھو تھیو سوا انھیں کھے سک

(دور جو لوگ جلوہ جمال دیکھ کر اس کے گردیدہ بنے' آلام مصائب سے گران ذوق جمال اور بڑھا کوئی بات ان کو ماندہ نہ کر سکی' اس روی جمال کی طرف وہ بڑھتے نہ گئے)۔

امدادی کتب

۱۔ "تاریخ معصومی" (سندھی ترجمہ مخدوم امیر احمد)' سندھی ادبی بورڈ

۲۔ "تحفۃ الکرام" (سندھی ترجمہ مخدوم امیر احمد)' سندھی ادبی بورڈ

۳۔ "مظہر شجہانی" میرک یوسف' تصحیح و مقدمہ و حواشی پیر حسام الدین شاہ راشدی

۴۔ "منشور الوصیت و دستور الحکمت" میاں نور محمد کلہوڑو' تحقیق پیر حسام الدین شاہ سندھ ادبی بورڈ'

۵۔ "تاریخ سندھ' عہد کلہوڑا" (دوسری جلد)' غلام رسول "مہر"

۶۔ "شاہ عنایت اللہ اور ان کے ساتھی و ہم عصر" مولانا غلام قاسمی' ایضاً"

۷۔ شاہ عنایت شہید کی سوانح کا ماخذ" پیر حسام الدین شاہ راشدی' "نئی زندگی" ماہنامہ' شہید نمبر ۱۹۷۰ع

۸۔ "شاہ شہید عنایت اللہ صوفی" ڈاکٹر داؤد پوتا' ایضاً"

۹۔ "شاہ شہید صوفی" محبوب علی مچا' ایضاً"

۱۰۔ "بیاض ہاشمی" (قلمی) مخدوم محمد ہاشم ٹھٹھوی۔

۱۱۔ "پیغام لطیف" جی' ایم' سید

۱۲- (۱) "شاہ" (۲) "سچل" (۳) "سامی" کلیان آڈوانی

۱۳- "سامی کا سلوک" (تیسری جلد) بی' ایچ' ناگرانی

۱۴- "شاہ ہو رسالو" کلیان آڈوانی

۱۵- "رسالو کوثر (اردو) محمد اکرام

۱۶- رود کوثر (اردو) محمد اکرم

۱۷- رود کوثر (اردو) محمد اکرم

17- "Shah Abdul Latif of Bhit" H. T. Solrey.

18- "Sind and its Sufis" J. P. Gularaj.

19- "Sind Before the Muslim Conquest" H. T. Lambrick.

20- "Reflection on History" Jacob Burckharebt.

21- " Peotics and Rhetoric" Aristotle.

22- "To the Nations" Paul Richard.

23- " Patriotism in Literature" Jhon Drinkwater.

24- " Cropsin Sind" A. W. Khoso.

ہم اور شاہ

شاہ عبداللطیف بھٹائی سندھ کے متبرک اور دنیا کے عظیم انسان تھے۔ سندھ کے لئے شاہ کا پیغام اتحاد کا پیغام ہے۔ انسانوں کے اتحاد اور عمل سے ہی انسانوں کی قسمتیں بنتی ہیں۔ اتحاد ہر حالت میں کسی مقصد کے لئے ہوتا ہے انسانوں معاشروں اور قوموں کے اتحاد کا مقصد اجتماعی مفاد ہوتا ہے۔ اجتماعی مفاد کے لئے انفرادی اور گروہی مفاد قربان کرنے پڑتے ہیں۔ آج کی وسیع آبادیوں والی اور علم ہنر سے بھری ہوئی دنیا میں معاشرہ یا قوم کے اجتماعی مفاد کا مطلب اکثریت کا مفاد ہے۔ دنیا کے دوسرے ممالک کی طرح سندھ میں بھی اکثریت محنت کش عوام کی ہے' ہاریوں ' مزدوروں' کمیوں اور کاسبیوں اور دوسرے کئی محنت کش لوگوں کی۔ کمانے والے اور پیدا کرنے والے وہ ہیں' اور پانے والے کھانے والے دوسرے ہیں (جو کہ بہت کم تعداد میں ہیں۔ شاہ صاحب نے اپنے تمام رسالے میں سب سے زیادہ ذکر ایسے ہی اکثریت عوام کا کیا ہے۔ یعنی ہاریوں اور دستکاروں کا کاٹنے والوں' لوہاروں کمہاروں' مہانوں اور کشتیانوں کا' اوڈوں اور دھناروں کا دستکاریوں اپنے عام غریب اور مسکین بھائی بھائیوں کا۔ اسی لئے شاہ کا پیغام ہمارے لئے آج بھی وہی ہے۔ کہ ہم اپنے مشترکہ اور بڑے مفاد کے لئے' یعنی سندھی

سماج کی اکثریت کے مفاد کے لئے اپنا الگ الگ چھوٹے اور محدود مفاد کو بھول کی آپس میں متحد ہونا چاہیے۔ سب کے مفاد کے لئے 'سب کے اتحاد' اکثریت کے مفاد کے لئے اکثریت کا اتحاد قائم کریں۔ کیونکہ لٹے ہوئے اور پسے ہوئے' کیونکہ محروم و مجبور' مصائب کے شکار اور دکھی وہ ہیں' اور دکھی حالت کو بدلنی کے لئے وہ بھی آپس میں ملنگے' متحد ہوں گے اور عمل کے لئے اٹھیں گے اور جدوجہد کریں گے۔

"ڈکیون جان نہ مڑن' تان تان پنی انہ تھی'
ڈٹی واریون پڑریون' کپساڑھاکپل سندن
پیون ھٹن پپئی ھٹ ھٹن' روئندیون روں واریون
روہ بندر جان کپئی' نہ سکا لنامر سمو'
کپر وکن کرپی' جنن ماڻی ا مجنھ مھی'
ایڑو دور ٹکھی' تبدنہ کجی ناکڑا
ھٹس ھکی' ساسی سارن ما بھیاں اس مرک
وجھن عونہ فرق' رک وھندی ء راندھ"

لیاقت میڈیکل کالج کی "ڈیبیس مضرن اور لطیف تحفہ۔ ۱۹۷۷ء

"...... دیکھنا یہ ہے کہ مذہب کا اقتدار کی دنیا یعنی سیاست میں' اور اخلاقیات کی دنیا میں' تاریخی عمل کیسا رہا ہے؟ اقتدار کی دنیا میں اس نے انتہائی شدت اور سنگدلی سے کام لیا ہے۔ لازمی طور پر اسے ایسا ہی کرنا تھا کیونکہ مذہب تو اپنے معمول کے مطابق اپنے معتقدین پر جن کو اس سے سچے ایمان کی روشنی مل رہی ہے' یہ فرض عائد کرتا ہے کہ وہ کافروں کو کفر کے اندھیروں سے باہر نکالیں۔ اس کے علاوہ' ایمان کی اس روشنی کا تعلق جسم سے زیادہ روح سے ہے' اور تاریخ نے اس حقیقت کا ثبوت ہمیشہ کافروں کے خون اور گوشت یعنی ان کی لاشوں کی صورت میں دیا ہے۔ اس سلسلے میں یہ کہ جو لوگ سچے دین کی روشنی سے انکار کرتے ہیں وہ بہرحال اس بات سے بھی انکار کریں گے کہ مومنوں کو ان پر حکومت کا حق ہے۔ بس اسی مقدس ایمان کی روشنی اور مقدس کتاب کی تبلیغ سے دوسرے ممالک میں مومن قوموں کے لئے اور حکمرانی کے جھنڈے گاڑنے کا مکمل جواز اور لاجواب سبب پیدا ہوتا رہا ہے۔ ایسے میں اگر چند داعی' مبلغ' درویش اور عالم مخلص طور پر اخلاص اور پاکبازی کے پتلے تھے بھی تو اس سے اصل بات میں کوئی فرق نہیں پڑتا' بلکہ یہی پاکبازی اور بے لوث ہونا قوت اور اقتدار کو تحفظ اور تقدس کا کام دیتا رہا جب ان کے دوسرے مومن بھائی ایک قوت اور اقتدار کو پوری تندہی اور جوش سے استعمال کرتے رہے کہ وہ اپنے اس جہاد کے عیوض جنت

کے مالک اور وارث بن سکیں گے' آخرت کی جنت سے زیادہ اس دنیا کی جنت کے غلاموں کے ' باغوں کھیتوں دریاؤں اور وادیوں کے' محکوم قوموں کی محنت مزدوری اورخون پسینے کی جنت کے مالک اور وارث۔ مقدس دین اپنے ان چند نیک اور متقی عالموں اور درویشوں سے تقریباً لاتعلق اپنے ان جنت پسند مجاہدین کی ہر فتح پر حاصل کردہ مال غنیمت کو اپنے خدائے قدوس کی طرف سے مومنوں پر لازوال فضل و کرم کی بارش اور اس کا احسان عظیم کہتا اورظاہر کرتا رہا' وہ اپنے خدا سے ان کا خدا ان سے خوش تھا۔ اس طرح اخلاقیات کی دنیا میں ایک تو مذہب اپنے معتقدین کے ذہن میں یہ غرور پیدا کر دیتا ہے کہ ان کا کردار اوران کے اخلاقی اقدار اور دوسروں سے بلند اور اعلیٰ ہیں' اس لئے ان کا یہ حق بجانب ہے اورفرض بھی کہ دوسروں کے عقیدوں کو بدلیں اور انہیں راہ راست پر لانے کی کوشش کریں' اور اس کام کے لئے وہ ہر قسم کے طریقے استعمال کرنے میں حق بجانب کریں' اور دوسرے یہ کا انسانی تہذیب کے ان اختلافات اور تنازعات کو حل کرنے میں مومنوں کے عقیدہ پرست اورخود پسند جنون نے انسانی اخلاقیات کو ناقابل عبور اور پرفریب روپ دے دیا ہے جیسا سمندر کب ناقابل عبور تھا اور جیسا آج بھی وہ پر فریب ہے۔ اس لئے ہم پورے اعتماد سے یہ کہہ سکتے ہیں کہ جو بھی اگر چاہے کہ حقیقتاً" ایک نیک اور بااخلاق انسان بن کر رہے (ہمیں دل میں ایسا کوئی شک نہیں لانا چاہیے کہ بااخلاق اور نیک بننا ممکن بھی ہے یا نہیں' بلکہ میں سمجھتا ہوں کہ ہمیں اس بات پر پورا یقین ہونا چاہیے کہ ایسا ممکن ہے) تو اسے سب سے پہلے اس ایمان کے منبع ناموں "گناہوں اور منافقتوں سے خود کو کھینچ کر الگ کرنا ہے۔ تحقیق' اگر خدا کے تصور یا مفہوم میں کوئی سچائی یا کوئی افادیت ہے' تو وہ یہی ہو سکتی ہے کہ اس کی مدد سے ہم اپنے اندر دل میں زیادہ کشادہ اور زیادہ آزاد اور زیادہ پیار کرنے والے انسان بنیں۔ اگر خدا ہمیں ایسا نہیں بنا سکتا' تو پھر بہتر ہے کہ ہم اس کا نام لینا چھوڑ دیں۔"

جس میں بالڈون (ایک امریکی سیاہ فام پادری)

بحوالہ

FreedoM Reason or revolution

ایڈیٹر گارڈن بوکر' روٹلیج اینڈ پال کاگن لیمیٹڈ' لندن' ۱۹۷۰ء

شاہ لطیف پر تحقیق کرنے والوں نے ان کی تاریخ پیدائش کے بارے میں اختلاف کیا ہے۔ ڈاکٹر ٹرمپ نے شاہ کا سن ولادت ۱۶۸۰ء ڈاکٹر لیلا رام نے ۱۶۸۸ء علامہ آئی آئی قاضی نے ۱۶۸۹ء تحریر کیا ہے اور غالباً" یہی درست معلوم ہوتا ہے۔ شاہ صاحب کے سن وفات جس پر سب متفق ہیں ۱۷۵۲ء ہے۔ شاہ صاحب کے ہم عصر شعراء میں پشتو کے خوشحال خان خٹک' پنجابی کے بلھے شاہ' سندھی کے بچل اور ساہی' اردو کے ولی دکنی' شاہ مبارک آرزو' ظہور الدین حاتم' اور مرزا جان جاں اں مظہر شامل ہیں۔ شاہ عبداللطیف بھٹائی کے دور کلہوڑا حکمران یار محمد اور اس کے بیٹے نور محمد کے ادوار حکومت پر محیط ہے رعنا حید مضمون "شاہ لطیف کا پیغام"

(روزنامہ جنگ' ۱۹۳۸ء)

"..... جیسا کہ تاریخ طاہری' وغیرہ میں آیا ہے مذکورہ سید (قاضی سید شکر اللہ شیرازی) ۹۰۶ء ہرات سے قندھار وہاں سے شاہ بیگ کے حکم سے ۹۲۷ء میں (جس سال شاہ بیگ نے سندھ پر حملہ کیا تھا) ٹھٹھہ آئے اور مرزا شاہ حسن ابن شاہ بیگ کے زمانے میں (یعنی دوسرے سال جب شاہ بیگ کے مرنے کے بعد شاہ حسن نے اس کی جگہ لی)۔ اس نئی فتح کردہ سرزمین کے منصب قضا سے سرفراز ہوا۔ شروع میں وہ تاجر کی حیثیت سے آئے تھے۔

"..... بزرگوں سے سنا ہے کہ جہاں موصوف نے آکر سکونت اختیار کی ان کی

اولاد آج تک وہیں رہتی ہے۔ ان سے پہلے وہاں انصاری قبیلے کے لوگ آباد تھے سید شکر اللہ کی اولاد میں سید محمد حسن بن سید علی اکبر بن سید عبدالواسع سنا ہے کہ اس قبیلے کے کچھ لوگ سندھ کے دیہات میں کہیں رہتے ہیں اور ان کے بزرگ جب بھی ٹھٹھہ آتے ہیں تو اس محلے میں آکر ہم سے ملاقات کرتے ہیں۔

"..... قبروں کے چبوترے جن میں (ان سادات کے) بزرگ آرام پذیر ہیں وہ ان کے (یعنی ان قبیلے والوں) کے تھے جن کی کئی قبریں آج بھی موجود ہیں۔

"..... سید شکر اللہ کی قبر سید عبداللہ مغرب میں آج بھی اہل اللہ کے لئے زیارت گاہ ہے۔

"..... کہا جاتا ہے کہ مذکورہ سید کے علاوہ تین باکمال بزرگ بھی ٹھٹھہ آئے تھے۔ ان کے دوستوں میں ایک خاص قسم کا اتحاد تھا۔ وہ بزرگ (۱) سید مب (۲) سید کمال اور (۳) سید عبداللہ ہیں"

(علی شیر قانع ۔تحفتہ الکرام" ۱۱۸۱ھ ' ص ص ۳۸۲۔ ۳۸۳۔ ۳۸۴)

"..... سید کمال ــــــــ اصلاور شیراز کے باشاز کے باشندے تھے اور مذکورہ سید شکر اللہ کی دوستی اور رفاقت کے باعث ٹھٹھہ آئے تھےــــــــ (جن کے) وہ گہرے دوست تھے اور ان چار دوستوں میں شامل تھے جن کاذکر شکر اللہ کے بیان میں ہو چکا ہے..... وفات کے بعد وہ اپنی رہائشی حویلی میں دفن ہوئے' ان کے مقبرے کی برکات کئی ملکوں میں مشہور ہیں اور کرامات عوام اور خواص کے دلوں میں محفوظ ہیں"

(ایضاً" ص ۴۹۳)

"سید شاہ مب ' یہ غوث الثقلین (پیران پیر) سے ہیں۔ بزرگوار سید کمال شیرازی اور سید شاہ عبداللہ حسینی کے ساتھ شاہ بیگ ارغون کے زمانے میں سید شکر اللہ شیرازی کے ہمراہ ٹھٹھہ آئے تھے (جن سے) ان کو خاص محبت تھی۔ پڑوس کی رفاقت کے خیال سے وہ اس جگہ اب آرام پذیر (مدفون) ہیں۔ ایک مرید کے گھر آکر ٹھہرے

تھے۔ ان کی کرامات روشن اور مشہور ہیں۔ ان کے مقبرے کی زیارت عام خلق خدا کے حصول حاجات کی ضامن ہے۔ (ایضاً" ص ص ا۔ ۶۰۲)

"سید شاہ عبداللہ وہ بھی قطب الاقطاب' غوث الثقلین' حضرت پیر حسینی علیہ الرحمتہ کی اولاد میں سے ہیں اور مذکورہ (چار) دوستوں یعنی سید مب' سید کمال اور سید قاضی شکر اللہ میں سے ایک مقتدر دوست تھے۔ وہ بزرگوار۔ شاہ بیگ ارغون کے زمانے میں ٹھٹھہ آئے اور خفیہ طور پر پہاڑی کی اس جگہ پر بیٹھ کر گوشہ نشینی اختیار کی تھی جہاں ان کا مزار موجود ہے مکلی کے اس حصے پر بیٹھ کر جو روحانی فیض ان بزرگ کو حاصل ہوا' وہ قلم کے ذریعے بیان کرنے سے باہر ہے۔" (ایضاً" ص ۔ ص ۶۱۴۔۶۱۵)

سندھ پر مسلمان ارغونوں کے حملے کے وقت اور سات دن ان کے ہاتھوں ٹھٹھہ کے قتل عام اور لوٹ مار کے وقت سندھ اور سندھ کے شہر ٹھٹھہ کی اسلامی فضا کچھ اس طرح کی تھی :۔

"روایت ہے کہ (سندھ کے بادشاہ) جام نظام الدین علم کے عاشق تھے' ابتدائی تعلیم مدرسوں اور خانقاہوں میں حاصل کی تھی' وہ نہایت حلیم خلیق اور بہترین صفات و حسین عادات کے مالک تھے۔ وہ کمال کی حد تک زاہد و عابد بھی تھے۔ ان کی فضیلت اور اصل حقیقت اس سے بھی بلند ہے جو قلم بند کی گئی ہے۔ ان کی حکومت کے دنوں میں سنت نبوی کی پیروی اس حد تک عام ہو چکی تھی جس کا تصور بھی ممکن نہیں۔ مسجدوں میں باجماعت نماز پڑھنے کا رواج اس قدر ہو گیا تھا کہ کوئی بھی چھوٹا یا بڑا اکیلا جا کر مسجد میں نماز پڑھنا پسند نہ کرتا تھا۔ اگر کبھی کسی وقت کوئی باجماعت نماز ادا نہ کر سکے تو پشیمان رہتا اور دو تین دن تک استغفار پڑھتا رہتا"۔ (تاریخ معصومی۔ ص ۔ ص ۱۰۲)

اور اس کے بعد جب مسلمان ارغونوں کے حلیف مسلمان مغل حاکم تھے اور ان

کے ظلم کی کالی رات چھائی ہوئی تھی تب ٹھٹھہ کی اسلامی فضا کا تاریخ میں یہ ذکر آیا ہے:-

"..... عالم، فاضل، شاعر، کاتب، خوش نویس اور خدا پرست اشخاص اس شہر میں بہت زیادہ رہتے تھے ------- اور ان کے اکثر لوگ پکے مسلمان تھے اور روزے نماز اور شرع کی پیروی کی ہر ممکن کوشش کرتے تھے۔ اس قدر کہ یہاں کئی بڑی جامع مسجدیں ہیں، جن میں ۲۰ اور ۳۰ ہزار لوگ جمعہ کی نماز کے لئے اکٹھے ہوتے تھے۔ جامع مسجدوں کے علاوہ شہروں کے محلوں میں چھوٹی، چھوٹی مسجدیں ہیں، وہ سب جمعہ کے دن اس قدر بھری رہتیں کہ عین نماز کے وقت اگر کوئی نماز کے لئے آتا تو بمشکل اسے نماز کے لئے جگہ مل سکتی۔

(مظہر شاہجہانی" میرک یوسف، تصحیح اور حاشیہ وغیرہ حسام الدین راشدی ص ۳۲۰)

Fith column افراد کا منظم گروہ، جو بیرونی حملہ آور فوج کے فائدے کے لئے ملک کے اندر بیٹھ کر کام کرے اور ان کے لئے اندر ہی اندر میدان تیار کرے۔ شاہ بیگ ارغون نے ۹۲۷ھ (۱۵۲۰ء) میں سندھ پر حملہ کرنے سے پہلے اپنے چار دوستوں پر مشتمل ایک ٹولہ ٹھٹھہ روانہ کیا تھا جو تاجروں کے بھیس میں آئے۔ اس میں ایک خاص قسم کا اتحاد تھا۔ وہ بعد میں خود کو غوث الثقلین پیران پیر دستگیر کی اولاد کہلاتے تھے۔ انہوں نے ظالم و جابر ارغونی حکومت کی مضبوطی اور اس کو جاری رکھنے میں ارغونوں کی مذہبی مدد کی اور ان سے مال غنیمت اور اقتدار میں شریک رہے۔

اس طرح ۱۷۳۷ء میں سندھ ہ نادر شاہ کے حملے سے صرف دو سال پہلے اس کے سپہ سالار، احمد شاہ ابدالی کے پیرو شاہ فقیر اللہ علوی اپنے ملک (روہاس جلال آباد افغانستان) سے ہراول دستے کے طور پر اپنے پورے گروہ سمیت ٹھٹھہ اور پھر شکار پور آئے۔ ٹھٹھہ کی مختصر رہائش کے دوران انہوں نے مخدوم محمد ہاشم کی شاگردی قبول کی اور ان سے علوم ظاہری اور اسلوک مخفی اور فقر کی تینتیس سلسلہ جات کی اجازت

حاصل کی۔ ۱۷۴۷ء میں نادر شاہ قتل ہوا اور احمد شاہ ابدالی خراساں اور سلطنت نادریہ کی مشرقی اراضی کا دعویدار ہوا۔ سندھ کو اسکے ہاتھوں اور اس کے جانشینوں کے ہاتھوں جو صعوبتیں اور پریشانیاں ملیں اس کی داستان خود نادر سفاک کے خون ریزی لوٹ مار اور تباہ کاریوں کی داستان سے کم درد ناک نہیں۔ لیکن احمد شاہ ابدالی پھر بھی اس اللہ کے بزرگ حاجی فقیر اللہ علوی کے اتنے معتقد خاص اور مرید صادق تھے کہ سندھ میں داخل ہوتے ہی جوتے اتار دیتے اور ننگے پاؤں ملتے کیونکہ یہ ان کے مرشد کا وطن تھا اور وہ اپنے مرشد کے پیروں کی مٹی تبرک کے طور پر اپنے ساتھ رکھتا تھا۔ سندھ کی تاریخ میں مذہب اور سیاست، کی یعنی ایمان اور اقتدار کی استبدادی اور استحصالی شراکت کی یہ کوئی اپنی نوعیت کی واحد یا پہلی یا آخری مثال بھی نہیں۔

سال ۱۶۰۵ء میں ایک یورپی مسافر، سیلبنک، اتفاق سے سندھ کے روہڑی شہر میں جا نکلا اور وہاں کی دکھی قابل رحم حالت دیکھ کر پکار اٹھا "یہ شہر کس قدر دکھی لوگوں سے بھرا ہوا ہے"۔

چالیس سال بعد ۱۶۴۵ء میں ایک دوسرے یورپین مسافر، اس اپلر، نے شمالی سندھ کی سیر کرتے ہوئے وہاں کے آباد کاروں اور کسانوں کی حالت دیکھ کر لکھا ہے کہ وہ "بے حد مجبور اور مظلوم تھے۔"

۲۵ جنوری ۱۶۵۹ء میں ایک انگریز تاجر نے اپنے برطانوی تاجر ساتھیوں کو ایک خط لکھا جس میں انہیں بتایا "یہاں (سندھ میں) قحط اور پلیگ کے باعث لوگوں کا بڑا حصہ ختم ہو گیا ہے اور باقی تھوڑے بہت بچ گئے ہیں"۔

۱۶۹۹ء میں جب (شاہ عبداللطیف بھٹائی دس برس کے تھے) ایک انگریز سیاح ہملٹن جب ٹھٹھہ پہنچا تو اس نے دیکھا کہ اس کے وہاں پہنچنے سے پہلے ۸۰ ہزار کوری (جولاہے) پلیگ کی بیماری کی وجہ سے مر چکے تھے۔ سندھ کی حالات کا ذکر کرتے ہوئے آگے چل کر وہ بتاتا ہے کہ تمام راستوں پر سفر بہت ہی خطرناک تھا اور اس کا عام طریقہ یہ تھا کہ

اونٹوں کے قافلے چلتے تھے جن کے ہمراہ ایک سو سے دو سو تک گھوڑے سوار حفاظت کے لئے ساتھ ہوتے تھے۔ اس نے ایک قافلے کا ذکر بھی کیا ہے جس پہ راستے میں چار پانچ ہزار لٹیروں نے حملہ کیا ان کے دو سو پچاس گھوڑ سوار محافظ اور پانچ کے قریب سوداگروں کو موت کے گھاٹ اتار دیا تھا۔

"مغلوں کے آخری زمانے کے ایک ٹھٹھہ کے نواب اعظم خان کا اندازا" چار برس کا (۱۷۱۵ - ۱۷۱۷) دور اہل سندھ کے لئے نحوست کا زمانہ تھا۔ ایک تو ملک میں سخت قحط کی حالت تھی دوسرے ایک حق شناس شاہ عنایت شاہ کی شہادت کا واقعہ پیش آیا" داؤد پوٹہ "شاہ شہید" رسالہ "نئی زندگی" مئی ۱۹۷۰ء

ارغونوں، ترخانوں اور مغلوں کے دور کے اس عام ابتلا اور بد امنی کے حالات کے برخلاف اس سے پہلے کی آزاد اور خود مختار سندھ کے حالات کیسے تھے ؟ اور راویت کرتے ہیں کہ اس جام نظام الدین نے سندھ کا داخلی اور سرحدوں کا ایسا انتظام رکھا تھا کہ لوگ بڑے اطمینان سے راستوں پر سفر کرتے تھے۔ اس کے دور حکومت میں عالم، صالح اور درویشوں نے بڑے آرام سے وقت بسر کیا اور رعایا اور سپاہی بھی آسودہ اور خوشحال رہے ــــــــ (تاریخ معصومی" ص ۱۰۳

"کلہوڑا حکمرانوں نے زرعی کام میں جتنی دلچسپی اور تندہی سے کام کیا اس بنا پر وہ سندھ میں سب سے زیادہ نہریں اور نالے بنانے والوں میں شمار ہوتے ہیں، خاص طور پر میاں نور محمد نے شمالی سندھ میں جہاں پہلے پہل ان کی حکومت قائم ہوئی نہروں کے ذریعے کھیتی باڑی شروع کی۔

"انہوں نے سندھ میں گھاڑواہ کا سرشتہ قائم کیا جس میں نورواہ (دس میل) شاہ جی کڑ (۲۰ میل) اور داتے جی کڑ (۲۰ میل) شامل تھیں جس میں آگے چل کر پہلی نہر دریائی سندھ پر جدید بیراج کے آبپاشی نظام میں وارہ کی شاخ نامی نہر کے طور پر استعمال ہوتی ہے، اور دوسرے نالے اس نظام میں دوسری شاخوں کے طور پر کام میں

آئے۔ کلہوڑا دور ڈاتیجی کڑ پر لاڑکانہ سے شدا کوٹ تک مسافری اور باربرداری کے لئے کشتیاں بھی چلتی تھیں۔

دریائے سندھ کے بائیں کنارے کے ساحل سے کلہوڑوں نے نئے نالے کھدوائے مثلاً" (نوشہرو ڈویژن میں) نصرت نالہ، مراد نالہ، باغ نالہ اور فیروز نالہ جو سب نولکھی آبپاشی سرشتے کے حصہ تھے، سب نالے بعد میں روہڑی کینال سے ملا دیئے گئے۔

"اس طرح کلہوڑوں نے وسیع غیر آباد زمینوں کو آباد کیا، مگر پھر بھی وہ نظام آبپاشی کے جدید علمی معیار کے مطابق کوئی بڑے انجینئر نہ تھے اس لئے ان کے نالوں میں اتنی ترتیب اور سدھ نہ تھی انہوں نے تقریباً ہر اس جگہ نالے بنائے جہاں سے پہلے دریائے سندھ کے بہنے کے نشانات موجود تھے اور ان کے نالوں کا رخ موجودہ جھیلوں کی طرف رہتا تھا۔ اس لئے ان نالوں اور چھوٹے دریاؤں کی مجموعی لمبائی ہزاروں میل بن جاتی تھی۔ لیکن ونکہ با اختیار مقامی حکمران تھے۔ اس لئے ایسے آبپاشی کا پورا نظام وہ اپنی نگہداشت میں پھر بھی اچھی طرح چلانے میں کامیاب رہے۔"

یہ شاہ اور ساہی کے دور میں سندھ کی تہذیبی میدان میں محب وطن قومی ریاست کی پناہ میں زرعی اجتماعی معاشی بہبو کے لئے کی گئی عظیم کوشش کی مثال ہے۔

"ترک سیاست، ضعف ریاست است ــــــــ و ریاست باسیاسات واجبی،
ورد مقدمہ عدالت خودرا و غیر ربیک نظر باید دید ــــــــ در خیر فکر شرو در فکر خیر،
نفع شایان سرا سر در اخلاص و محبت است۔ اول حق غرباء و مساکین و یتیمان و
مظلومان عائد بگردن میشود روز و شب فکر مکاری ــــــــ وھر آفریدہ بہتر بدانید،
وھر مرد را مرد بدانید

(اردو ترجمہ ـــ سیاست کو چھوڑنے کا مطلب ہے ریاست کی کمزوری ــــــ

آئے ۔ کلہوڑا دور ڈاتیجی کٹر پر لاڑکانہ سے شدادکوٹ تک مسافری اور باربرداری کے لئے کشتیاں بھی چلتی تھیں۔

دریائے سندھ کے بائیں کنارے کے ساحل سے کلہوڑوں نے نئے نالے کھدوائے مثلاً" (نوشہرہ ڈویژن میں) نصرت نالہ' مراد نالہ' باغ نالہ اور فیروز نالہ جو سب نولکھی آبپاشی سررشتے کے حصہ تھے' سب نالے بعد میں روہڑی کینال سے ملا دیئے گئے۔

"اس طرح کلہوڑوں نے وسیع غیر آباد زمینوں کو آباد کیا' مگر پھر بھی وہ نظام آبپاشی کے جدید علمی معیار کے مطابق کوئی بڑے انجینئر نہ تھے اس لئے ان کے نالوں میں اتنی ترتیب اور سدھ نہ تھی انہوں نے تقریباً ہر اس جگہ نالے بنائے جہاں سے پہلے دریائے سندھ کے بہنے کے نشانات موجود تھے اور ان کے نالوں کا رخ موجودہ جھیلوں کی طرف رہتا تھا۔ اس لئے ان نالوں اور چھوٹے دریاؤں کی مجموعی لمبائی ہزاروں میل بن جاتی تھی۔ لیکن ونکہ با اختیار مقامی حکمران تھے۔ اس لئے ایسے آبپاشی کا پورا نظام وہ اپنی نگہداشت میں پھر بھی اچھی طرح چلانے میں کامیاب رہے۔"
یہ شاہ اور ساہی کے دور میں سندھ کی تہذیبی میدان میں محب وطن قومی ریاست کی پناہ میں زرعی اجتماعی معاشی بہبو کے لئے کی گئی عظیم کوشش کی مثال ہے۔

"ترک سیاست' ضعف ریاست است ------- و ریاست باسیاسات واجبی'
ورد مقدمہ عدالت خودرا و غیر ربیک نظر باید دید ------- در خیر فکر شرو در فکر خیر'
نفع شایان سرا سر در اخلاص و محبت است۔ اول حق غرباء و مساکین و یتیمان و
مطوبان عائد بگردن میشود روز و شب فکر ملکداری ------- وحر آفریدہ بہتر بدانید'
وحر مرد را مرد بدانید
(اردو ترجمہ --- سیاست کو چھوڑنے کا مطلب ہے ریاست کی کمزوری ------

کیونکہ ریاست (کی کامیابی) کے لئے سیاست ضروری ہے..... عدل انصاف کی ہر بات میں خود کو اور دوسرے کو ایک نظر سے دیکھنا چاہیے۔ خیر کہ وقت پر شر کی فکر اور شر کے وقت خیر کا خیال رکھنا چاہیے۔ آپ کی بھلائی ساری کی ساری اخلاص اور محبت میں ہے۔ پہلے پہل تمہاری گردنوں پر غریبوں' مسکینوں' یتیموں اور ضرورت مند لوگوں کے حق کا بوجھ ہے..... اور آپ کو دن رات ملک کے انتظام او بہبود کا خیال رکھنا چاہیے اور آپ کو چاہیے کہ ہر تخلیق کی ہوئی (چیز) کو مفید اور بہتر سمجھیں اور ہر انسان کو انسان سمجھیں......" "روایت ہے کہ شاہ صاحب نے اس دور کی بے مثال گلوکارہ مائی گلاں کو دعا دی گلاں سے گل ہو گا"۔ پھر اس کا نکاح نور محمد سے ہوا جس کے بطن سے غلام شاہ پیدا ہوا۔